www.urducouncil.nic.in
قیمت: -/10 ₹

آدمی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

مئی 2019

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 3 شمارہ: 5 مئی 2019

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، چھتر گلی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
روبرو	عورت ذہنی طور پر کمزور نہیں ہے: ڈاکٹر ثروت خان	حقانی القاسمی	5
شخصیت	تیرہویں صدی کی ایک خاتون حکمراں: رضیہ سلطان	ڈاکٹر صالحہ رشید	9
پرواز کے نئے آسمان	شفقت آمنہ چمپارن کی پہلی مسلم خاتون (آئی اے ایس)	ابوسلمان احمد	13
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		14
جہان نسواں	عورت پر اس کے خاوند یا رشتے داروں کے ذریعہ ظلم سے متعلق سپریم کورٹ کا کلیدی فیصلہ	خواجہ عبدالمنتقم	15
	اردو رباعی میں شرنگار رس اور نسوانی روپ	ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی	18
	جوش ملیح آبادی کی فطری شاعری	رضیہ پروین	23
	قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں نسوانی کرداروں کا معاشرتی ونفسیاتی مطالعہ	ڈاکٹر حارث حمزہ لون	26
	خواتین افسانہ نگاروں میں تانیثی رجحان 1980 کے بعد	عالیہ	31
	صغریٰ مہدی کے افسانوں کا فکری کینوس	سمیہ بانو	34
کہانیاں	مدو بنام پبلیسٹی	ڈاکٹر خورشید جہاں	40
	دھند اور موسیقی	تبسم فاطمہ	42
	غرور اور اعتماد	چشمہ فاروقی	44
	بحث اور انا	تبسم آرا	47
حسن سخن	ریحانہ خاتون، میمونہ علی چوگلے		50
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		53
صحت	ہماری غذا	شکیل احمد	55
آرائش وزیبائش	حسن کی نگہداشت		57
تاثرات	نگر نگر سے		59
خواتین خبرنامہ			61

مشعل

اردو زبان اپنے اندر بے پناہ وسعت رکھتی ہے۔ یہ وہ زبان ہے جس نے لامکانی کے باوجود ہندوستان اور بیرون ممالک میں اپنی شناخت قائم کی۔ کوئی بھی زبان ہو اس کا مقصد فاصلے مٹانا اور دلوں کو باہم جوڑنا ہوتا ہے۔ اردو زبان پر بھی یہ بات سو فیصد صادق آتی ہے۔ زبان کی ترقی اور تنزلی دونوں کا انحصار اس زبان کے بولنے والوں پر ہوتا ہے۔ زبان کے بولنے والے جتنی تعداد میں ہوتے ہیں وہ زبان اتنی ہی ترقی کرتی ہے۔ ہندوستان ایک کثیر الجہت اور کثیر اللسان ملک ہے۔ یہاں مختلف زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ کچھ زبانیں اپنا اثر قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں اور جو زبانیں ایسا نہیں کر پاتیں وہ آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہیں۔ اردو کی جنم بھومی تو ہندوستان ہے لیکن دنیا میں شاید ہی کوئی ایسی جگہ ہو جہاں اردو زبان بولنے سمجھنے والے افراد موجود نہ ہوں۔ یہ اتحاد، رواداری اور محبت کی زبان ہے۔ اس زبان کے اندر غیر کو بھی اپنا بنا لینے کی قوت موجود ہے۔ یہ لوگوں کے دلوں میں بستی ہے۔

اردو دنیا بھر میں اعلیٰ اور معیاری زبان کے طور پر تسلیم کی جا چکی ہے۔ یہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ بیرون ممالک میں بھی ترقی کر رہی ہے۔ وہاں پر بھی اردو کی نئی بستیاں آباد ہو رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہاں پر اردو کی تعلیم و تدریس اور تحقیق کا بہترین انتظام بھی ہے۔ بیرون ممالک کی یونیورسٹیوں میں نئے نئے موضوعات پر تحقیق بھی ہو رہی ہے اور اردو کے شعبے وہاں اردو زبان کی آبیاری میں مصروف ہیں۔

اس کے باوجود اردو کے تحفظ اور فروغ کے لیے ہمیں اس بات پر مزید غور کرنا چاہیے کہ اردو زبان بولنے والے لوگوں کا تناسب کتنا ہے۔ ہمیں اپنی زبان کو کس طرح سے تحفظ فراہم کرنا ہے۔ اردو کو روزگار سے جوڑنے کے لیے ہمیں کون سی تدابیر اختیار کرنی ہیں۔ اردو معاش کی زبان بن سکتی ہے یا نہیں، اس میں تعلیمی مواد کی کمی تو نہیں ہے۔ ان تمام امور پر بھی ہمیں غور و فکر کی ضرورت ہے تبھی زبان کے تحفظ اور فروغ کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

اردو زبان کے تحفظ اور فروغ کو لے کر بہت سی باتیں کی جاتی ہیں۔ اردو کے بیشتر ادارے اپنے اپنے طور پر اردو کی بقا اور اس کے فروغ کے لیے متحرک اور فعال ہیں اور اپنی اپنی کوششوں سے اس سمت میں کارہائے نمایاں بھی انجام دے رہے ہیں۔ ان اداروں کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار صرف کسی ادارے یا حکومت پر نہیں ہے بلکہ کچھ حد تک معاشرے کے افراد کی بھی ذمہ داری ہے۔ حکومتی سطح پر تو اردو کے فروغ کے لیے ہمیشہ ہی کوششیں ہوتی رہی ہیں لیکن ہمیں اردو کو ابتدائی سطح پر بھی مضبوط کرنا ہوگا۔ زبان کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی جڑوں کو مضبوط کریں اور اردو کو ابتدائی تا ثانوی سطح پر اپنے بچوں کے لیے ضروری خیال کریں۔ زبان کو زندہ رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے گھروں میں اردو کو باقی رکھیں۔ ہمیں ایسی راہیں تلاش کرنی ہوں گی جو اردو زبان کی ترقی میں اہم رول ادا کر سکیں۔ ایسا لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا جو زبان کے تحفظ میں معاون ثابت ہو۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اردو کی بقا اور تحفظ کے لیے کام کرتی ہے۔ اردو زبان کا فروغ اس کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر یہ ادارہ اردو کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اس ادارے نے ملک کے طول و عرض میں موجود اشخاص تک اپنی اسکیموں کے ذریعے پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ عوام و خواص سے اردو زبان کو جوڑنے کے لیے کونسل نے مختلف کارنامے انجام دیے ہیں۔ کونسل آئے دن اردو زبان سے متعلق مختلف پروگراموں کا انعقاد کرتی رہی ہے۔ اردو زبان کے تحفظ اور فروغ کے لیے کونسل کی کوششیں ہنوز جاری ہیں تاکہ اردو زبان ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

حقانی القاسمی

عورت ذہنی طور پر کمزور نہیں ہے

ڈاکٹر ثروت خان

وقت بدلتا ہے تو تصویریں اور تقدیریں بھی بدل جاتی ہیں۔ یہی عورت جو کبھی جائیداد کی مالک ہوا کرتی تھی۔ عہد بدلا تو جائیداد بن کر رہ گئی۔ مردوں کی ملکیت، محکوم، معاشی اور جنسی غلام۔ کہتے ہیں کہ وہ ویدک عہد تھا جب عورت کو ایک آزاد فرد کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکتی تھی۔ عورتوں کا اپنا ایک پرسنل اسپیس تھا، حتیٰ کہ مردوں کی طرح انھیں کئی شوہر رکھنے کی اجازت حاصل تھی۔ ہر سطح پر ایک مساوات کا عملی تصور موجود تھا۔ مگر رفتہ رفتہ عورت کے اختیارات اور حقوق محدود ہوتے گئے۔ اسے مقدس کتابیں پڑھنے تک کی مناہی ہوگئی تھی وہ گھر کی چہار دیواری میں قید کردی گئی۔ اسی وقت سے عورت کے وجود سے اذیت کی ایک داستان جڑ گئی اور رسومات اور روایات کی آڑ میں عورتوں کا استحصال ہونے لگا۔ کبھی ستی کی شکل میں تو کبھی بیوگی کی صورت میں۔ مرد مرجاتا تو عورت بھی اس کی چتا کے ساتھ جل جاتی۔ وہ بیوہ ہوجاتی تو معاشرے کی نظر میں منحوس ہوجاتی اور ایک کال کوٹھری میں قید کردی جاتی۔ اس کی زندگی ایسی اجیرن بنادی جاتی کہ جسے باقی دنیا سے اس کا کوئی رشتہ ہی نہیں رہ جاتا۔ رسومات کی آڑ میں عورت کی اس سے زیادہ تحقیر اور تذلیل اور کیا ہوسکتی ہے؟ اور المیہ یہ بھی ہوا کہ عورتوں نے اس تذلیل کے خلاف اپنی زبان تک نہیں کھولی بلکہ بہ سروچشم ہر اس فرمان کو تسلیم کرتی گئی جس سے اس کے وجود کی نفی ہوتی تھی۔ یہ تو راجہ رام موہن رائے اور ودّیا ساگر ہی تھے جنھوں نے عورت کے اوپر ہونے والے ان مظالم کو محسوس کیا اور عورتوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کی ورنہ عورتیں اسی طرح رسومات کی صلیب پر لٹکی رہتیں۔

اب وقت بدلا ہے، عورتوں کو نئی پرواز ملی ہے۔ مگر پھر بھی ایک بڑا حصہ ابھی تک ان ہی رسومات میں قید ہے۔ ہمیں شہروں کی گلیمرس عورتوں کے چہرے کی چمک دمک اور ان کے عیش و عشرت کو دیکھ کر یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ آدھی دنیا میں سب خیریت ہے۔ اس خیرہ کردینے والی روشنی کے باہر کچھ اندھیرے بھی ہیں جن میں عورتیں صدیوں سے بھٹک رہی ہیں۔ ان سے باہر آنے کے راستے ان رسومات اور توہمات نے بند کردیے ہیں جنھیں غیر منطقی طور پر عقیدے کی شکل دے دی گئی ہے۔ رسموں کی ان زنجیروں کو توڑے بغیر عورت صحیح معنوں میں آزاد، خود مکتفی نہیں بن سکتی۔ عورتوں کے تعلق سے ابھی بھی بہت سی گرہیں باقی ہیں۔ 21ویں صدی کے سائنٹفک عہد میں یہ گرہ کھلنی چاہیے تاکہ عالمی سطح پر عورتیں جس repression کی شکار ہیں، ان کا کچھ مداوا ہوسکے۔ ویسے اب عورتیں بھی اپنے حقوق سے آگاہ ہوچکی ہیں۔ وہ صحیفوں کی ہدایات اور تضادات دونوں سے واقف ہیں۔ کیونکہ اب وہ اوراق جو کبھی

ممنوع تھے عام ہوچکے ہیں۔ عورتیں اب یہ سوچ رہی ہیں کہ آخر ابھی تک وہ زیرو پوائنٹ پر ہی کیوں کھڑی ہیں؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ شاید ابھی تک عورتوں کا ایک بڑا طبقہ خاموش ہے۔ اس تعلق سے رانی مکھرجی کی فلم 'مردانی' کے کچھ sleazing content سے قطع نظر عورتوں کے لیے ایک مثبت پیغام ہے۔ dont be silent, take a stand۔ عورت اگر اسی طرح خاموش رہے گی تو بیگم رقیہ سخاوت حسین کی 'سلطانہ کا خواب' کیسے شرمندۂ تعبیر ہوگا۔ عورتیں چیخیں نہیں، چلائیں نہیں، مگر اپنی اذیت سے معاشرے کو آگاہ تو کریں، کیونکہ آگہی کے بغیر ان کے درد کا علاج ممکن ہی نہیں ہے۔ عورت کو اب یہ سوچنا ہوگا کہ اسے صرف sex object بن کر جینا ہے یا objective ہو کر اپنے مسائل کا محاکمہ اور معاشرہ سے مکالمہ کرنا ہے۔ عورتوں کو رمبھا اور اروشی کے آرکی ٹائپل امیج سے بھی باہر نکلنا ہوگا کہ عورت متاعِ کوچہ و بازار نہیں ہے۔ صنفی امتیازات کے خاتمے اور سماجی جمہوریت کے لیے یہ ضروری ہے کہ عورتوں کو مساوی حقوق دیے جائیں۔

ڈاکٹر ثروت خان نے عورتوں کے ان ہی مسائل کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی بہت سی باتوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے اور اختلاف کیا بھی جانا چاہیے کیونکہ یہ ہر انسان کا بنیادی حق ہے اور یوں بھی مکمل اتفاق موت کے مترادف ہے۔ فضیل جعفری نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ 'اتفاق رائے اور خصوصاً مکمل اتفاق رائے میرے نزدیک فاتحہ خوانی کا دوسرا نام ہے۔'

ڈاکٹر ثروت خان کا تعلق بانی ریاست ٹونک امیر خان کے خانوادے سے ہے۔ بنیادی طور پر یہ سنبھل (مرادآباد) کی ساکن ہیں۔ لیکن بعد میں ان لوگوں نے ٹونک میں مستقل اقامت اختیار کرلی۔ ان کے دادا محبت علی خاں محبت بھی شاعر تھے اور ان کے والد محترم ثروت علی خان بڑا عمدہ ادبی ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے 'میر خان اور ان کے حالات' کے نام سے ایک کتاب کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ ثروت خان کی شادی جودھ پور کے ایک پروقار خاندان میں ہوئی۔ ان کے بقول راجستھان کے سابق وزیراعلیٰ مرحوم برکت اللہ خان ان کے چچا سسر تھے۔ ثروت خان مقتدر رسائل وجرائد میں اپنی تحریروں کے ذریعہ ایک الگ شناخت بنا چکی ہیں۔ وہ تانیثی مسائل اور مباحث پر مستقل لکھتی رہی ہیں۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ 'ذروں کی حرارت' (2004) ہے۔ ان کا ایک ناول 'اندھیرا پگ' کے عنوان سے 2005 میں اشاعت پذیر ہوا جو بہت ہی اہم موضوع پر ہے۔ انھوں نے راجستھان کی بیواؤں کی اذیت بھری

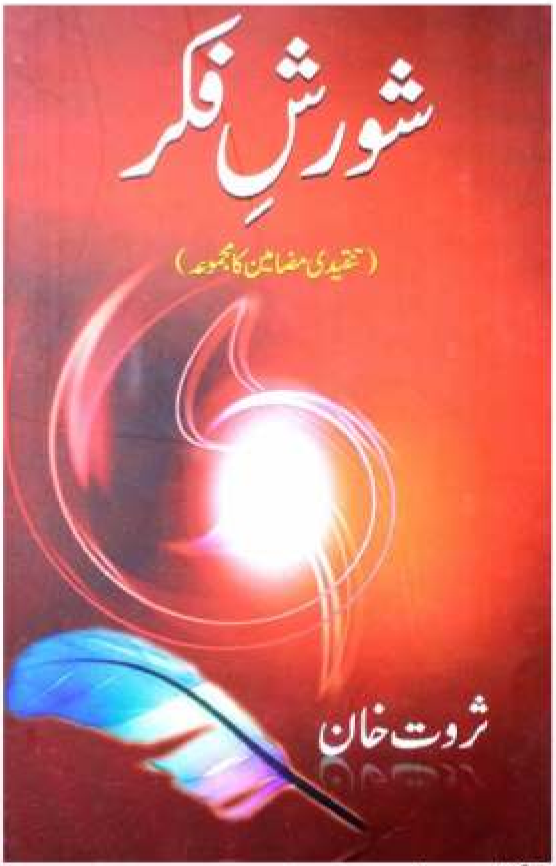

زندگی کی جو عکاسی کی ہے، اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آج کے دور میں بھی بیواؤں کے ساتھ بہیمانہ سلوک جاری ہے۔ میرا بائی پر انھوں نے ایک اچھی کتاب مرتب کی ہے جو ادبی حلقوں میں کافی قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ ان کے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ 'شورشِ فکر' کے عنوان سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ پیش ہے ڈاکٹر ثروت خان سے حقانی القاسمی کے انٹرویو کا ایک مختصر حصہ:

س: کیا عورت ذہنی اور جسمانی اعتبار سے کمزور ہے؟ نہیں تو پھر دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر کیوں مانی جاتی ہے؟

ثروت: پریکٹیکل لائف میں عورت ذہنی اور جسمانی طور پر کمزور ہرگز نہیں ہے۔ ہمارے سامنے ایک سے بڑھ کر ایک ریڈیکل خواتین کا شاندار ماضی، حال ہے ـــــ مگر مانتے نہیں گویا گلے کی ہڈی ہے جو حلق سے اترتی ہی نہیں۔ فیمنزم اسی حرکت پر تو چوٹ کرتی ہے۔ مثالیں سامنے ہیں۔ ذرا بھر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے، سوالات اپنے آپ بیٹھتے چلے جائیں گے۔ دیکھئے وہاں۔ حضرت خدیجہؓ مارکیٹنگ اینڈ سیلس مینجمنٹ کو سنبھالے نظر آرہی ہیں۔ حضرت فاطمہ زہراؓ اپنے حق، باغ فدک کا

مطالبہ کرنے دربارِ خلافت میں پہنچی ہوئی ہیں۔ کربلا میں امام حسینؓ کی شہادت کے بعد کوفہ اور شام کے بازار اور یزید کے دربار میں جناب زینبؓ کے تاریخ ساز خطبات تشہیرِ حق کا سبب بن رہے ہیں، یہی نہیں معاشرہ کی زبردست اصلاح کے لیے خطبات دینے والی حضرت رابعہ بصری اور اس قانون داں Jurist کو بھی یاد کر لیجیے جس سے حضرت عمرؓ تک مسائل کا حل دریافت کرنے آتے تھے یعنی حضرت عائشہؓ۔ اب خواتین کے بازوؤں کی طاقت بھی دیکھیے۔ جہاں رومن امپائر کے خلاف سپاہی کے بھیس میں حضرت خولہؓ کھڑی نظر آتی ہیں۔ مدینہ میں جنگ کے موقع پر یہودیوں کی عہد شکنی پر انھیں موت کے گھاٹ اتارنے والی حضور اکرمؐ کی بہادر پھوپھی حضرت صفیہ جمورچہ سنبھالے کھڑی دکھائی دیتی ہیں۔ اب آپ کو ذہانت اور بہادری، شجاعت اور دلیری کا عالم دیکھنا ہو تو اسلامی جنگوں میں اہل بیت اور صحابہ کرام کی خواتین کو Red Cross Society کے فرائض کو انجام دیتے دیکھ لیجیے۔ رضیہ سلطانہ، چاند بی بی، جہاں آرا، فیشن ڈیزائنر نور جہاں (جس نے فوج کی وردی ڈیزائن کی تھی جو کم وبیش آج تک رائج ہے) لکشمی بائی، میرابائی، رشید جہاں، عصمت چغتائی، اندرا گاندھی اور اب کرن بیدی، مسز نوئی، سونیا گاندھی —— غرض لاتعداد نام ہیں جنھیں گنوانا مقصود نہیں بلکہ زمانہ کی آنکھیں کھلوانا ہیں۔

اب رہی مذہبی نظریے کی بات کہ دو عورتوں کی گواہی ——! دیکھیے دورِ جاہلیت میں سماجی نظام جس طرح کا تھا، کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اسلام نے اصلاحی نقطہ نظر کو پیش کیا... معاف کیجیے ہم تو الجھتے زیادہ ہیں۔ جتنی پیچیدہ زندگی ہوگئی ہے اتنی ہی گرہیں ہم میں پڑ گئی ہیں حالانکہ علمائے دین میں بھی سنجیدہ اذہان ہیں، لیکن وہ سامنے نہیں آتے۔ اب ایسے میں ان باتوں کو خامیاں بتا بتا کر یا ایسے سوال اٹھا اٹھا کر جس سے یہ ثابت ہوجائے کہ عورت کو اسلام بھی دوئم درجہ کی مانتا ہے۔ عورت ذات کا نفسیاتی استحصال نہیں تو اور کیا ہے؟ نازیبا عمل سے جہاں ایک طرف اسلام کے اصلاحی مشن کو ضرب پہنچی ہے۔ وہیں دوسری طرف عورت جیسی احترام کے لائق شے اور خالق کائنات کی بہترین تخلیق کہ جسے خود اس نے تخلیق کار بنایا۔ غیر اسلامیوں کو 'دعوت نظارہ' دینے کی ترغیب نہیں تو اور کیا ہے؟ مرد حضرات کو چاہیے کہ جہاں ان کی عقل کام نہ کرے یا اتفاق رائے نہ ہو اور کسی نتیجے پر نہ پہنچیں، وہاں چپ ہی رہیں۔ ہم ہندوستانی ہیں، ہندوستان کے آئین میں یقین رکھتے ہیں، مانتے بھی ہیں اور اسی کے تحت ہمارے روزمرہ کے جھگڑوں کا نپٹارہ بھی ہوتا ہے۔ اس آئین میں ایک عورت کی گواہی کافی ہے۔ ہمارے مسلمان بھائیوں کی مشکل یہ ہے کہ ان کی پریکٹیکل زندگی پر وہ قوانین نافذ ہی نہیں ہوتے جن میں وہ گلے گلے ڈوبے ہیں، یعنی وہ Practical life تو ہندوستان کے آئین کے تحت یا شریعت سے مستعار ملے جلے روپ میں گزارتے ہیں اور صرف جذباتی طور پر شریعت سے جڑے رہتے ہیں۔ پھر ہندوستان میں آپ یہ سوال اٹھا رہے ہیں۔ دراصل یہ ہندوستان کا جھگڑا ہے ہی نہیں۔ ہمارے آئین میں یہ ہے ہی نہیں۔ یہاں ابھی تک تو ایک عورت کی گواہی کو کوئی چیلنج نہیں کرسکا۔ ہم ابھی تک عورت مرد کے جھگڑوں میں ہی مبتلا ہیں۔ یہ جھگڑا اور کتنی شہادتیں مانگے گا اور جھگڑا بھی ہو نگوڑا ایک طرفہ۔ ایسے تضادات کو اسلام سمجھ لیا ہم نے۔ ایک چھیڑ ہے یہ تو جو چلی آتی ہے، عورت سے بھی اور مذہب سے بھی۔

س: کیا عورتوں کے چست، تنگ اور مختصر لباس کو آپ ترغیباتِ جنسی میں شمار کرتی ہیں؟

ثروت: اقسامِ لباس سے ترغیبات جنسی کا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ جب آج کی طرح تہذیب و تمدن کے ایسے دھارے نہیں تھے۔ اس وقت انسان برہنہ رہا کرتا تھا۔ لیکن وہاں جنسی ترغیبات کی یہ دلیلیں یہ دہائیاں کہاں ملتی ہیں۔ معاف کیجیے ڈھکی چھپی کو بھی دبوچ لیا جاتا ہے۔ دراصل جنسی خواہشات کی بے راہ روی انسان کے باطن کی گندگی کو مترشح کرتی ہے۔ باطن میلا ہوتا ہے مشتعل خیالات سے، خیالات کی اشتعال انگیزی اور برانگیختگی میں کمی بیشی کا دارومدار دو صورتوں پر ہے۔ پہلی صورت لاشعور کی دبی کچلی خواہشات کی تکمیل کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں اور دوسری صورت مطلوب کی طلب میں اضافے کے باعث —— عورت کو مرد سماج مطلوب سمجھتا ہے۔ معاشرہ کی تمام بیماریاں یہیں سے پنپ کر جنم لیتی ہیں۔ آزادی، فیشن پرستی اور مے نوشی کی محفلوں کی چکا چوندھ ہو یا متوسط طبقہ کی چہار دیواری، لبادوں سے لدی عورت ہو یا دفتری تھکان سے نڈھال نسائیت ہو، محنت مزدوری کرتی، دھول مٹی میں سنی لمبا گھونگھٹ لیے بچہ کو چمٹائے چھاتی ہو۔ بوڑھی جوان، بچی، سب چلتا ہے۔ میلا باطن تو جنس کا بھوکا درندہ ہوتا ہے۔ اسے تہذیب اور قدروں سے کوئی لینا دینا ہوتا ہے نہ انسانیت سے کوئی سروکار۔

جہاں تک لباس کے تنگ اور مختصر ہونے کا سوال ہے، یہ اطلاق مرد و عورت دونوں پر ہے کہ وہ زیبائش کو کس حد تک نمائش میں تبدیل کریں کہ سماج کی تہذیب اور اس کے نظم و ضبط کو ملحوظ رکھا جاسکے۔ ڈریس کوڈ پابندی کی علامت ہے۔ پابندی انا کو ٹھیس پہنچاتی ہے جس سے بغاوت جنم لیتی ہے۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ پابندی اشتیاق کو جنون میں تبدیل کر دیتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جنون کسی بھی حد تک

چلا جاتا ہے۔ یہ عورت مرد کی نفسیات کا معاملہ نہیں بلکہ انسان کی نفسیات کی پیچیدگیاں ہیں۔

آپ کے سوالات سے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ رسم و رواج کی پابندیاں، مذہب کی جکڑبندیاں اخلاق کی پاس داریاں، شرم وحیا کی حدبندیاں اور عزت کی دہائیاں، سب طبقہ نسواں کے لیے ہی مانے بیٹھے ہیں اور ساری بے شرمیاں اگر طبقہ رجال کرتا ہے تو جوں نہیں رینگتی! بات حریت، مساوات کی ہے، رسم و رواج، حقائق اور آپسی ہمدردی کی ہے کیونکہ سماج مختلف گروہوں اور شعبوں کا، انسانی برتاؤ اور طور طریقہ کا، حریت اور مساوات کا نام ہے۔ مردانہ اقتدار و امتیاز کا نہیں۔ یہ کھیل یہ مات دونوں طرف سے بند ہونا چاہیے۔

س: زندگی کے مدوجزر، نشیب وفراز، جن میں نئی نسل کے لیے کوئی انسپریشن ہو؟

ثروت: آج زندگی کے ہر شعبہ میں برق رفتاری سے تبدیلیاں ہو رہی ہیں مگر تبدیلی کا عمل، اس کی نوعیت اور سمت، اس کے نتائج، ان تمام تبدیلیوں کے باعث سماج، سیاست، معاشرہ، ثقافت اور قانون کون کون سے مرحلوں سے گزر رہا ہے، اس پر توجہ کرنی ہوگی کیونکہ دنیا کے کسی بھی مسئلہ کا سیدھا تعلق انسان سے ہے۔ انسان کو ہم دو افراد کی شکل دیتے ہیں۔۔۔۔ عورت اور مرد۔۔۔۔ اب اگر کوئی مسئلہ ہے تو وہ دونوں کو برابر سے متاثر کرتا ہے اور آدھی دنیا عورت سے ہے، آدھی مرد سے۔ جہاں عورت کا فرض بن جاتا ہے کہ وقت اور حالات کی نبض پر اپنی پکڑ اور نظر رکھے، زندگی کو متاثر کرنے والے ہر عمل کی مکمل معلومات اور واقفیت بہت ضروری ہے کیونکہ ادھ کچرا گیان مصیبت ہی پیدا کرتا ہے اور یہی ہو بھی رہا ہے۔ بیداری تو ہے مگر ادھوری، آزادی تو ہے مگر نامکمل، تعلیم تو ہے مگر کامل نہیں۔ اس نامکمل کی تکمیل کرنے کا وقت ہے۔ لیکن ایک سوال یہ بھی ہے کہ تکمیلیت کی انتہا کیا ہے؟ اور مکمل آزادی کا تصور کیا ہے، اس سوال کا جواب جہاں عورت کو تلاش کرنا ہے وہیں مرد کو بھی سوچنا چاہیے کہ آخر خود اس کی آزادی کا کیا تصور ہے؟

اقتصادی، معاشی اور سماجی حالات کو بہتر بنانے کے لیے روشن خیالی کا دامن تھامنا ہوگا، عقل اور ہمت سے آگے بڑھ کر کچھ ایسا تانا بانا بننا ہوگا جو ان تمام عناصر میں تال میل بٹھا کر معاشرہ کو ترقی کی راہ پر لے جائے اور حیات کی ایسی خوشگوار فضا قائم ہو کہ جس کی خوشبو میں نہ کوئی مرد ہو، نہ کوئی عورت۔ نہ کوئی اعلیٰ ہو، نہ کوئی ادنیٰ، نہ کوئی نفسیات کا مارا ہو نہ کوئی رسومات کا ستایا۔ بس انسان ہوں، انسانیت ہو اور پیار کی پھوار سے ساری دھرتی مہک اٹھے۔

□□□

ڈاکٹر صالحہ رشید

تیرہویں صدی کی ایک خاتون حکمران

رضیہ سلطان

ہندوستانی معاشرت زمانۂ قدیم سے جننی جنم بھومش چہ سورگا دپی گریسی کو مشعل راہ بنا کر آگے بڑھتی رہی ہے۔ یہ قول شری رام چندر جی کے حوالے سے راماین میں درج ہے۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی لکشمن کو ہدایت دیتے ہیں کہ ماں اور جائے پیدائش کا مرتبہ سورگ سے اعلیٰ ہے لیکن اسی راماین کی رو سے ان کی بیوی سیتا کو اپنی آبرو کی حفاظت کی گواہی دینے کی خاطر مشکل آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ زمانہ تو اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہا مگر ہماری قدریں بالخصوص عورتوں کے معاملے میں زمانے کی رفتار کا ساتھ بخوبی نہ نبھا سکیں۔ مذکورہ بالا واقعہ کی مانند ہی ایک پر تضاد واقعہ تیرہویں صدی کی اویلی تاریخ میں درج ہے اور وہ ہے سلطان رضیہ کا دہلی کے تخت پر متمکن ہونا۔ سلطان رضیہ کی زندگی سے واقف ہو کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ تیرہویں صدی سے ہوتے ہوئے آج اکیسویں صدی میں ہماری ہندوستانی معاشرت عورتوں کے معاملے میں کتنی پیش رفت کر سکی ہے۔ منہاج سراج رضیہ کے وقت کا خاص مؤرخ ہے۔ وہ اپنی کتاب طبقات ناصری میں رضیہ کے اوصاف اس طرح بیان کرتا ہے:

'بادشاہ بزرگ وعاقل وعادل وکریم وعالم نواز وعدل گستر ورعیت پرور ولشکر کش بود۔'

چند سطروں کے بعد منہاج لکھتا ہے:

'چون از حساب مردان در خلقت نصیب نیافتہ بود' این ہمہ صفات گزیدہ چہ سودش کند۔' یعنی مرد پیدا نہیں ہوئی تھی اس لیے باوجود حکمران ہونے کے یہ تمام اوصاف حمیدہ اس کے کس کام کے۔ رضیہ سلطان التمش کی بیٹی ہے۔ وہ اپنے بھائی رکن الدین فیروز کے بعد دہلی کے تخت پر 634ھ میں جلوہ افروز ہوئی۔ وہ ہندوستان کی مسلم خاتون حکمران تھی جس نے 37-634ھ میں یعنی 40-1236 تک حکومت کی۔ اس میں حکمرانی کے تمام اوصاف موجود تھے جو اس کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کا ثبوت ہیں۔ منہاج اسے عاقل، عادل، عالم، عالم نواز، عدل گستر اور رعیت پرور ہونے کے ساتھ ہی لشکر کش بھی لکھتا ہے۔ آگے 'این ہمہ صفات گزیدہ چہ سودش کند' بھی لکھ دیتا ہے۔ رضیہ ایک عورت ہے۔ اسے کن حالات کا سامنا کرنا پڑا، اس پر ایک اجمالی نظر ڈالنا ضروری ہے۔

1206 سے لے کر 1290 تک دہلی کے تخت پر تین زبردست بادشاہ جلوہ افروز ہوئے۔ قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش اور غیاث الدین بلبن۔ ان میں شمس الدین التمش اپنی لیاقت کی بنا پر ممتاز نظر آتا ہے۔ رضیہ اسی باصلاحیت سلطان کی بیٹی ہے۔ اس کی معتبر تاریخ پیدائش تو نہیں معلوم ہاں کہیں کہیں 1205 ملتا ہے لیکن تاریخ پیدائش 14 اکتوبر 1240 بمقام کیتھل درج ہے۔ دیگر سلاطین کی مانند رضیہ کی تفصیلات نذر قلم نہیں کی گئیں لیکن اس کے خاندان کے ضمن میں اس کا ذکر آجاتا ہے۔ رضیہ کا باپ شمس الدین التمش سلطان بننے سے قبل ایک غلام کا

غلام تھا لیکن اس نے اپنی ذہانت اور ہوشمندی کے سبب تقریباً ایک چوتھائی صدی ہندوستان پر حکومت کی۔ وہ وسط ایشیا کے البریٰ نامی ایک معزز ترک خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے حاسد بھائیوں نے اسے تاجر جمال الدین کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا۔ وہ اسے پہلے غزنین اور پھر دہلی لے آئے جہاں وہ قطب الدین کا غلام بنا۔ چونکہ اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا لہٰذا اس کی ذہانت بچپن ہی سے عیاں تھی۔ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ خوبرو بھی تھا۔ قطب الدین نے اس کی عمدہ تربیت کی۔ شمس الدین نے تیزی سے ترقی کی۔ اسے مختلف اہم امور سونپے گئے۔ یہاں تک کہ قطب الدین ایبک نے اپنی بیٹی اس کے عقد میں دے دی۔ 1210 میں جب اس نے تخت سنبھالا تب تک وہ ایک ہوشمند مدبر اور عمدہ ناظم کی حیثیت سے پہچانا جا چکا تھا۔ اسے غلامی سے آزادی کا پروانہ بھی مل چکا تھا۔ وہ دین دار، سنجیدہ اور اعتدال پسند تھا۔ اس نے کئی اہم کارنامے انجام دیے۔ قطب الدین ایبک نے جو کام نا تمام چھوڑے تھے، شمس الدین التمش نے انھیں پورا کر کے شمالی ہند میں ترکوں کی ایک مضبوط سلطنت قائم کر دی۔ اس نے محمد غوری کے فتح کیے ہوئے علاقے واپس لے لیے ساتھ ہی نئے علاقے جیسے راجپوتانہ اور موجودہ اتر پردیش کے شمالی علاقے حاصل کیے۔ اس طرح ترکوں کی سلطنت کا وقار پھر سے قائم کیا۔ منگولوں کے حملوں سے اس نے اپنی سلطنت کو بچائے رکھا۔ اس نے اپنے ترک حریفوں کو بھی مغلوب کیا اور ان سے اپنی سلطنت کی حیثیت منوائی۔ اس طرح اس کے تین کارنامے قابل ستائش ہیں۔

(1) اس نے ایک نوزائیدہ حکومت کو ختم ہونے سے بچایا۔

(2) سلطنت کو ایک قانونی حیثیت بخشی۔

(3) دہلی کے تخت پر اپنے خاندان کو دوامی بنانے کی کوشش کی۔

1229 میں اسے خلیفہ المستنصر باللہ کی جانب سے ایک خلعت بھی عطا ہوئی جو اس بات کا مظہر ہے کہ اس کی حکومت کو مذہبی جواز بھی حاصل تھا۔

شمس الدین التمش اپنے بڑے بیٹے ناصر الدین محمود کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ 1229 میں جب خلیفہ بغداد نے التمش کو خلعت سے نوازا تو اس کے فوراً بعد ناصر الدین محمود کا انتقال ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب عالی مرتبت لوگ سلطان کی جانب سے ایک وارث کے اعلان کے منتظر تھے۔ ان حالات میں حکومت کے جانشین کی نامزدگی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ اس کا دوسرا بیٹا فیروز غیر ذمہ دار، کاہل اور عیش پرست تھا۔ باقی لڑکے کمسن تھے۔ ایسے میں اس کی نظر انتخاب رضیہ پر پڑی۔ وہ رضیہ کی صلاحیت سے مطمئن تھا۔

رضیہ نے اپنی زندگی کے شب و روز کوشک فیروزی میں ترکان خاتون کے ساتھ گزارے تھے۔ لہٰذا التمش کی نگاہ اس کی نقل و حرکت پر ہوتی تھی۔ التمش جب گوالیار کی مہم پر روانہ ہوا تو اس نے دہلی کا نظام رضیہ کے ہاتھوں سونپا تھا۔ رضیہ نے اپنی ذمہ داری بہت عمدگی سے نبھائی تھی۔ 1232 میں التمش گوالیار سے لوٹا تو اس نے تاج الملک محمود دبیر کو حکم دیا کہ وہ ایک فرمان تیار کرے کہ التمش رضیہ کو ولی عہد نامزد کرتا ہے۔ جب یہ فرمان تیار ہوا تو امرا نے التمش کی بیٹی رضیہ کے ولی عہد نامزد ہونے پر اعتراض جتایا۔ چند نے تو سلطان کو سمجھایا بھی کہ چونکہ حضور کے پاس نوجوان بیٹے ہیں جو بادشاہت کے لائق ہیں تو پھر لڑکی کو ولی عہد نامزد کرنے کا کیا مقصد؟ التمش کا جواب تھا کہ اس کے بیٹے ملکی امور کے انتظام کی صلاحیت نہیں رکھتے اور بیٹی رضیہ ان سے کہیں زیادہ لائق و فائق ہے۔ جہاں ایک طرف امرا نے تنگ نظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے رضیہ کی صلاحیتوں پر شک کیا وہیں دوسری طرف التمش کا یہ جرأت مندانہ قدم ہے۔ اس سے اس کی وسیع النظری اور تمام سماجی ممنوعات سے آزادی ظاہر ہوتی ہے۔ اس موقعے پر ایک سکہ بطور یادگار ڈھالا گیا اور التمش کے نام کے ساتھ اس پر رضیہ کا نام بھی لکھا گیا۔ التمش اپنی آخری سرحدی مہم سے واپسی پر شدید بیمار پڑ گیا اس لیے وہ رکن الدین فیروز کو لاہور اپنے ساتھ ہی لے آیا۔ چونکہ ناصر الدین محمود کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے لوگوں کی نگاہیں رکن الدین فیروز پر لگی تھیں۔ اسی موقع پر ایک چاندی کا سکہ جاری کیا گیا جس پر التمش کے ساتھ فیروز کا نام بھی لکھا گیا۔

التمش کی موت کے فوراً بعد امرا خاص طور سے صوبائی افسروں نے رکن الدین فیروز کو تخت پر بٹھایا۔ اس کی ماں شاہ ترکان ایک ترکی کنیز تھی اور سلطان کے حرم کی سردار بھی۔ رکن الدین کے تخت نشین ہونے پر اس نے ریاست کے معاملات اپنے ہاتھ میں لیے اور من مانی کرنی شروع کر دی۔ جس کے سبب تمام سلطنت میں لاقانونیت پھیل گئی۔ شاہ ترکان کے ساتھ رضیہ کے تعلقات کشیدہ تھے۔ دراصل شاہ ترکان رضیہ کے قتل کا ارادہ رکھتی تھی۔ ان حالات میں رضیہ نے اپنی ذکاوت اور تدبر کا مظاہرہ کیا۔ اس نے سرخ لباس پہنا اور دہلی کے لوگوں سے جو اس وقت فرض نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد میں جمع تھے، براہ راست اپیل کی کہ وہ اسے شاہ ترکان کی سازشوں سے بچائیں۔ اس زمانے میں سرخ لباس مظلوم انصاف کا مطالبہ کرنے کے لیے پہن لیا کرتے تھے۔ رضیہ کی اپیل پر مجمع نے محل پر حملہ کر دیا اور شاہ ترکان کو قید کر دیا۔ فیروز اس وقت دہلی سے باہر تھا۔ جب وہ دہلی لوٹا تو اس وقت تک شاہ ترکان سے خفا امرا رضیہ کے

وفادار بن چکے تھے۔ رکن الدین کو گرفتار کرلیا گیا۔ 18 ربیع الاول 634ھ بمطابق 19 نومبر 1236 اس کی چھ ماہ اور اٹھائیس دن کی ناکام حکومت کے بعد اسے قتل کردیا گیا۔

رکن الدین کے قتل کے بعد رضیہ دہلی کے تخت کی مالک ہوئی۔ اسے دہلی کے عوام کی زبردست حمایت حاصل رہی۔ رضیہ نے لوگوں سے کہا کہ اگر وہ ان کی توقعات پر پوری نہیں اترتی تو انھیں حق ہے کہ وہ اسے حکومت سے بے دخل کردیں۔ اس طرح تخت نشینی کو اس نے ایک معاہدے کی شکل دے دی۔ عوام نے ایک عورت کو اپنا حکمران تسلیم کرلیا۔ منہاج سراج اسے سلطان رضیۃ الدنیا والدین بنت السلطان لکھتا ہے۔ نیلسن کے مطابق سکوں پر بھی رضیہ کو سلطان جلالۃ الدنیا والدین یا پھر سلطان المعظم رضیۃ بنت السلطان درج ہے۔ ہندوستان کی یہ زبردست خاتون حکمران تھی۔ قرآن میں ملکہ صبا کا ذکر آیا ہوا ہے۔ ترکی اور ایران کی تاریخ میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جب عورتوں نے اقتدار سنبھالا ہے۔ مثلاً گور خان ختائی کی بیوہ اور اس کی بیٹی کو نیک خاتون، حلب کی صفیہ خاتون، مصر کی شجرۃ الدر وغیرہ لیکن ہندوستان کے تناظر میں یہ ایک جرأت مندانہ قدم تھا۔

بزم مملوکیہ میں تاریخ فرشتہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ رضیہ سلطان ایسے تمام اوصاف سے مزین تھی جو ایک عاقل اور صاحب رائے بادشاہ کے لیے ضروری ہیں۔ اصحاب نظر اس میں سوائے اس کے کہ وہ عورت تھی اور کوئی عیب نہیں پاتے۔ وہ قرآن مجید پورے آداب کے ساتھ پڑھتی تھی۔ دوسرے علوم سے بھی آگہی رکھتی تھی۔ اپنے باپ کے زمانے سے ہی ملکی معاملات میں دخل دیا کرتی تھی اور فرمانروائی کیا کرتی تھی۔ سلطان اس کی عقل و فراست اور فرزانگی دیکھ کر مانع نہ ہوتا۔ ان سب کے باوجود جب تخت نشینی کی باری آئی تو اس کے نااہل بھائی کو ترجیح دی گئی۔ رضیہ کی مدت کار تین برس سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کے عہد کو کچھ اس طرح پیش کیا جاتا ہے گویا یہ مدت صرف انتشار میں گزری۔

رضیہ کو مشکل اس وقت پیش آئی جب التمش کے مشہور وزیر نظام الملک جنیدی نے اس کی تخت نشینی کو منظور کرنے سے انکار کردیا۔ اسے کئی طاقتور امرا کی حمایت حاصل تھی اور اس کے حوصلے بلند تھے۔ اس نے ایک محاذ بنا کر دہلی کا رخ کیا۔ رضیہ کو چونکہ عوام کی حمایت حاصل تھی اس لیے وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ یہ باغی دہلی کے اطراف میں موجود رہے اور مستقل خطرہ بنے رہے۔ رضیہ نے عقل و تدبر سے کام لیا اور تمام سرکش عناصر کو یا تو ختم کردیا یا ان پر مکمل قابو پالیا۔ اس کے بعد اس نے انتظامیہ کی تشکیل نو کی۔ تھوڑے ہی وقت میں دیبل سے لکھناوتی تک کے امراء نے اس کے اقتدار کو تسلیم کرلیا۔ رضیہ نے تخت نشین کے فوراً بعد فوجی افسران اور مختلف اقطاع کے لیے گورنر بحال کیے اور ساتھ ہی شاہی دربار کے افسروں کو بھی۔ اس سے فارغ ہوکر اس نے تمام اقتدار پر اپنا کنٹرول رکھنے کی کوشش کی۔ وہ اب پردے سے باہر آگئی۔ ابھی تک جب وہ دربار لگاتی تھی تو درباریوں اور عوام سے ایک پردے سے الگ کردی جاتی تھی۔ محافظ خواتین اس کے ارد گرد کھڑی رہتیں اور اس کے بعد اس کے خونی رشتے دار۔ ان سب کو الگ ہٹا کر اب وہ براہ راست اپنے دربار کو مخاطب کرتی۔ وہ ہاتھی پر سوار ہوکر باہر نکلتی اور مرد حکمرانوں کی طرح تمام معاملات انجام

دیتی۔اس نے اہم عہدوں پر غیر ترکوں کا تقرر کر کے ترکی شرفا کو ناراض کر دیا۔ وہ اندر ہی اندر اسے تخت سے اتارنے کا منصوبہ بنانے لگے کیونکہ احسان مندی ترکوں کا شیوہ نہ تھی۔ ایتگین اور اختیار الدین التونیہ جیسے بڑے افسروں نے رضیہ کے خلاف سازش رچی جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس نے ایک حبشی جمال الدین یاقوت کو ایک بڑا عہدہ دے دیا تھا۔رضیہ جب 13 اپریل 1240 کو کبیر خان کے معاملات نپٹا کر دہلی واپس لوٹی تو اسے التونیہ کی بغاوت کا پتہ چلا۔اس سازش کو فرو کرنے کے دوران یاقوت کا قتل ہوا اور رضیہ کو گرفتار کر کے تبر ہند کی جیل میں ڈال دیا گیا۔اب سازشیوں نے دہلی کے تخت پر ایک عورت کی جگہ معز الدین بہرام کو بٹھا دیا۔ معز الدین نے سب سے پہلے ایتگین کو ختم کیا اور اس کے بعد التونیہ کی باری تھی۔ رضیہ نے صورت حال کا فائدہ اٹھایا اور التونیہ سے شادی کر لی۔ یہ ایک ایسا رشتہ تھا جو دونوں کے لیے فائدے کا سودا تھا۔رضیہ نے اس رشتے کے ذریعے اپنی قید سے آزادی کی توقع کی تھی اور التونیہ نے اسے اپنی ترقی کا ذریعہ سمجھا تھا۔ ماہ ربیع الاول 638 میں سلطان معز الدین بہرام ان لوگوں کے خلاف ایک فوج لے کر دہلی سے روانہ ہوا۔ رضیہ اور التونیہ کو شکست ہوئی۔ پسپا ہو کر جب وہ لوگ کیتھل پہنچے تو رضیہ کے سپاہیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا حالانکہ سارے سپاہی دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔اس کے دوسرے دن رضیہ بھی شہید ہو گئی۔ رضیہ نے نسلی بنیاد پر کھڑے ہو جانے والے محاذ سے شکست کھائی۔ اس کے زوال کی دوسری وجہ اس کا عورت ہونا تھا۔ یہ دشواری اس کے دل و دماغ کی پوری صلاحیتوں کے آزادانہ عمل کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی تھی۔ رضیہ کی ہوش مندانہ تدبیروں سے اس کا وقار دنوں دن بڑھ رہا تھا۔ اس کی قلمرو وسیع ہو رہی تھی لیکن امراء ایک مضبوط اور مطلق العنان حکمران کو تخت پر دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے۔اس لیے وہ رضیہ کی مخالفت پر اتر آئے تھے۔

مذہبی طبقہ رضیہ کو اس لیے ناپسند کرتا تھا کہ وہ مردانہ لباس پہنتی، گھوڑ سواری کرتی اور خود دربار میں موجود رہتی اور اپنی حکومت کو مضبوط اور مستحکم بنانے کی کوشش کرتی۔ اس نے فقط ساڑھے تین برس حکومت کی اور اس قلیل مدت میں اس نے خود کو ایک غیر معمولی کامیاب حکمران ثابت کر دیا۔ وہ دہلی کے تخت پر جلوہ افروز ہونے والی ایسی خاتون تھی جو دلیر اور بہادر ہونے کے علاوہ کامیاب سپاہی بھی تھی۔ سیاسی سازشوں اور جوڑ توڑ میں بھی مشاق تھی۔ اس کی وجہ سے ہندوستان میں ترکوں کی سلطنت کا وقار بڑھا۔ اس نے تخت و تاج کی منزل بڑھا کر اسے مطلق العنان بنا دیا اور اپنے حکم کو امراء و ملوک پر نافذ کیا۔ قطب الدین خود کو امراء کا محض قائد سمجھتا تھا۔ التمش اپنے امرا کے سامنے تخت پر بیٹھنے میں جھجکتا۔ رضیہ سے پہلے اور اس کے بعد بھی التمش کے خاندان کے افراد اپنے کردار اور شخصیت کے لحاظ سے کمزور تھے لیکن رضیہ اپنی صلاحیت اور لیاقت کی بنا پر سلطنت دہلی کی سیاست پر حاوی رہنے کی کوشش کرتی رہی۔ طبقات ناصری کا مصنف ہمیشہ اسے سلطان لکھتا ہے۔ وہ اسے جلیل القدر، عاقل، عادل، کریم، عالم نواز، عدل گستر، رعیت پرور اور لشکر کش حکمران بتاتا ہے۔ وہ رضیہ کو عالم نواز تو کہتا ہے لیکن اس کے حالات کے ضمن میں علماء و فضلا کا ذکر نہیں کے برابر کرتا ہے جب کہ التمش کا دربار اہل علم و فضل کا گہوارہ تھا۔ تاج الدین ریزہ جیسا مشہور شاعر رکن الدین کے دربار سے وابستہ تھا، اس کے یہاں رضیہ کے حوالے سے کچھ بھی دستیاب نہیں جب کہ رضیہ کے بعد تخت نشین ہونے والے رضیہ کے بھائی معز الدین بہرام (637ھ تا 639ھ) کی شان میں کہا گیا قصیدہ موجود ہے۔ ظاہر ہے رضیہ سلطان تو تھی مگر ایک عورت بھی تھی اس لیے اس کی مدح سرائی کا جواز نہیں بنتا تھا۔

ذرا سوچیے کیا آج اکیسویں صدی میں عورت سیتا اور رضیہ کے کرب سے نجات پا سکی ہے؟

(بحوالہ: تفہیم، ڈاکٹر صالحہ رشید، عرشیہ پبلی کیشنز دہلی)

□□□

Prof. Saleha Rasheed
HOD Arabic and Persian,
University of Allahabad
Prayagraj-211002 (U.P)

ابو سلمان احمد

شفقت آمنہ

چمپارن کی پہلی مسلم خاتون (آئی اے ایس)

موتیہاری مشرقی چمپارن کا ایک ایسا گاؤں جو بات بات پر بندوق نکالے جانے اور لڑائی جھگڑوں کے لیے بدنام ہے، جس گاؤں میں پچھلے سال ایک سرپنچ کو بے خوف بدمعاشوں نے نہ صرف گلا ریت کر بلکہ گولی مار کر ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیا تھا۔ اب یہی گاؤں شفقت آمنہ کے آئی اے ایس بننے کی وجہ سے پہچانا جائے گا۔ مشرقی چمپارن کے ادھکپر یا گاؤں کے سبکدوش ٹیچر محمد ظفیر عالم کی صاحبزادی شفقت آمنہ نے اس مرتبہ یو پی ایس سی کے امتحان میں 186 واں مقام حاصل کر کے نہ صرف اپنے کنبہ کا نام روشن کیا ہے، بلکہ وہ چمپارن کی پہلی ایسی مسلم آئی اے ایس خاتون بنی ہے جس نے یو پی ایس سی میں یہ مقام حاصل کر کے ہر ایک مسلم خاتون کے لیے مثال قائم کی ہے۔ شفقت کی اس کامیابی سے پورے گاؤں میں خوشی کا ماحول ہے۔ 65 سالہ والد ظفیر کامیابی کی مبارکبادی پر لوگوں کا شکریہ ادا کرتے نہیں تھک رہے ہیں، انھوں نے نمائندے سے بات کرتے ہوئے کہا ہے کہ میری خواہش ہے کہ میری بیٹی ایک ایماندار خادمہ بن کر کام کرے اور سماج میں امن وخوشحالی کے لیے کوشش کرے اور سب سے ضروری بات یہ کہ آج کی نئی نسل کو تعلیمی شعبہ میں آگے بڑھائے۔

واضح رہے کہ ظفیر عالم موتیہاری کے قریب گاؤں کے ایک اردو مڈل اسکول سے بطور ٹیچر سبکدوش ہوئے ہیں۔ 24 سالہ شفقت آمنہ نے نامہ نگار سے کہا کہ گاؤں کی پسماندگی، سہولیات کی کمی مجھے ہمیشہ محسوس ہوتی رہی ہے۔ اس لیے بچپن سے ہی میری خواہش تھی کہ لوگوں کے مابین رہ کر ان کے لیے کچھ کام کر سکوں تاکہ ان کی سوچ اور حالات کو بدل سکوں۔ میرے والد نے میری اسی خواہش کو سمجھتے ہوئے مجھے سول سروس میں جانے کے لیے تیار کیا۔ آمنہ نے کہا کہ میری پہلی پسند آئی اے ایس ہے اور مجھے پوری امید ہے کہ مجھے انشاءاللہ آئی اے ایس کیڈر ضرور ملے گا۔

شفقت نے کہا کہ میرے گھر کے حالات کبھی بہتر نہیں رہے ہیں۔ میرے والد اکیلے کمانے والے تھے لیکن کبھی بھی کسی طرح کی کوئی ایسی لاپروائی اور کوتاہی نہیں برتی جس کی وجہ سے میں نے آج یہ مقام حاصل کیا ہے۔

ملک کی لڑکیوں کے لیے شفقت کا پیغام: شفقت آمنہ نے کہا کہ لڑکیوں کے لیے حصول تعلیم نہایت ضروری ہے، لڑکیاں کبھی بھی خود کو کمتر نہ سمجھیں۔ وہ اپنی محنت، اپنی کوشش سے اپنا مستقبل سنوار سکتی ہیں۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ کو اپنی پالیسی اور اپنے اصول خود ہی بنانے ہوں گے اور یہ طے کرنا ہوگا کہ آپ کی زندگی میں کون سی چیز آپ کے لیے اہم ہے۔ (بشکریہ روزنامہ انقلاب)

شاعرات کے منتخب اشعار

نئے راستے نہ ڈھونڈے کہیں ان کی خستہ پائی
جنھیں لوٹ کر نہ پوچھا کبھی میرِ کارواں نے

ملے ہو آن کے منزل پہ کیا خبر تم کو
جو کارواں پہ سرِ رہ گزار گزری ہے

وحیدہ نسیم

کیا بتائیں تمھیں ہم منزلِ عرفاں کیا ہے
صرف اک عالمِ حیرت کے سوا کچھ بھی نہیں

مضطرب روح کو ہے مرکزِ اصلی کی تلاش
زندگی اک غمِ فرقت کے سوا کچھ بھی نہیں

سیدہ فرحت

تمھارے دم سے ہیں تنہائیاں بھی بزمِ حیات
تمھاری یادوں کا اک جمگھٹا سا رہتا ہے

ٹوٹی جو آس جل گئے پلکوں پہ سو چراغ
نکھرا کچھ اور رنگ شبِ انتظار کا

ممتاز مرزا

نہ جانے کون سا لمحہ مری تلاش میں ہے
جمیلہ دل بھی بہت چپ ہے اب زباں کی طرح

ٹوٹ جاتے تھے جہاں چاند ستاروں کے بھرم
ہم نے گرتے ہوئے دیکھا ہے ان ایوانوں کو

جمیلہ بانو

سایہ ہو شجر کا تو کہیں بیٹھ کے دم لیں
منزل تو بہت دور ہے اور دھوپ کڑی ہے

وہ میری ہی گم گشتہ حقیقت تو نہیں تھی
رستے میں کئی روز سے شئے کوئی پڑی ہے

زاہدہ زیدی

درد رکھا تو سمندر سے بھی گہرا رکھا
دل سے نکلی ہوئی ہر آہ پہ پہرا رکھا

کبھی یادوں کی تلاوت میں بھی مصروف رہی
رحل ہاتھوں کی بنا کر کبھی چہرہ رکھا

صغریٰ عالم

حصارِ ذات سے باہر نکل کے دیکھا جب
تو اپنے غم سے فزوں دوسروں کے غم نکلے

ساحل کے شانے ہیں بھیگے بھیگے سے
ان پہ سمندر سر رکھ کر رویا ہوگا

رشیدہ عیاں

میری آنکھوں میں خواب رہنے دے
سیلِ غم یہ سراب رہنے دے

نفس نفس مرا شعلہ دھواں دھواں ہے وجود
خود اپنی ذات کے آتش کدے میں گزری ہے

بلقیس ظفیر الحسن

عورت پر اس کے خاوند یا رشتے داروں کے ذریعہ ظلم سے متعلق سپریم کورٹ کا کلیدی فیصلہ

خواجہ عبدالمنتقم

مجموعہ ضابطہ فوجداری کی دفعہ 177 کے مطابق ہر جرم کی تحقیقات وسماعت معمولاً اس مقامی اختیار سماعت والی عدالت کی حدود میں کی جاتی ہے جہاں جرم کا ارتکاب ہوا ہو لیکن سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رنجن گوگوئی، جسٹس ایل۔ ناگیشورراؤ اور جسٹس سنجے کشن کول پر مشتمل سہ رکنی بینچ نے روپالی دیوی بنام ریاست اتر پردیش ودیگر والے میں الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلہ کو الٹتے ہوئے 9 اپریل 2019 کو کریمنل اپیل تعدادی 2019 / 619 ودیگر متعلقہ اپیلوں میں یہ کلیدی فیصلہ دیا ہے کہ کسی عورت پر اس کے خاوند یا خاوند کے رشتے داروں کے ذریعہ ظلم کیے جانے اور اسے matrimonial home (سسرال/شادی کے بعد جائے رہائش) سے نکالے جانے کی صورت میں متاثرہ کسی بھی ایسے مقام پر جہاں وہ گھر سے نکالے جانے کے بعد پناہ لیتی ہے مقامی اختیار سماعت والی عدالت میں مقدمہ دائر کرسکتی ہے۔ سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ مجموعہ تعزیرات ہند کی دفعہ 498 الف کے تحت دائر کیے گئے ایک معاملہ میں دیا ہے۔ یہ دفعہ کسی عورت پر اس کے خاوند یا خاوند کے رشتے داروں کے ذریعہ ظلم کیے جانے سے متعلق ہے۔ اس دفعہ کا متن درج ذیل ہے:

دفعہ 498 الف

''جو کوئی، کسی عورت کا خاوند یا خاوند کا رشتے دار ہوتے ہوئے، ایسی عورت پر ظلم کرے اسے 3 سال تک کی سزائے قید دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

تشریح: -اس دفعہ کی اغراض کے لیے ''ظلم'' سے مراد ہے—

(الف) کوئی ایسا دانستہ طرز عمل جو اس نوعیت کا ہو، جس سے یہ امکان ہو کہ عورت خودکشی کا ارتکاب کرنے پر مجبور ہو جائے گی یا جو اس عورت کی زندگی، عضو یا صحت کے لیے (خواہ ذہنی یا جسمانی) شدید ضرر یا خطرے کا باعث ہوگا،

یا

(ب) عورت کو اذیت پہنچانا جبکہ ایسی اذیت اس کو یا اس کے کسی رشتے دار شخص کو کسی جائیداد یا قیمتی کفالت کے کسی ناجائز مطالبے کو پورا کرنے کے نظریے سے یا ایسے مطالبے کو پورا کرنے سے اس عورت یا اس کے کسی رشتے دار شخص کے قاصر رہنے کی بنا پر ہو۔

تبصرہ

بے رحمی یا ظلم ایک ایسا تصور ہے اور ایک ایسی اصطلاح ہے جس میں قانونی اور حقیقی صورت حال دونوں کا امتزاج ہے اور یہ فیصلہ کرتے وقت کہ آیا متعلقہ فریق نے اس قسم کے جرم کا ارتکاب کیا ہے یا نہیں دونوں امور پر غور کرنا پڑتا ہے۔ عدالت عظمیٰ نے بھی سجاتا اور اودے پاٹل بنام اودے مدھوکر پاٹل والے معاملے میں اسی قسم کی رائے کا اظہار کیا ہے (ملاحظہ فرمایئے 2007 (1) ایچ ایل آر 546، ص 549 ایس سی)

نفسیاتی یا ذہنی مظالم

سپریم کورٹ نے سمر گھوش بنام جیا گھوش والے معاملے میں (2007 (1) ایچ ایل آر 497 ص، 520، 521، (ایس سی)) اس قسم کی صورت حال کی یہ کہہ کر مختلف مثالیں پیش کی ہیں کہ یہ علامتی ہیں نہ کہ اس قسم کے رویے کی مکمل تفصیل۔ اس معاملے میں بے رحمی یا ظالمانہ رویے کے حوالے سے جن نکات پر زور دیا گیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(1) اگر دماغی پریشانی، اضطراب یا پیہم ایذا رسانی کے باعث

ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ دونوں کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ناممکن ہو جائے۔

(2) فریقین کی ازدواجی زندگی کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد اگر یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ گمراہ فریق کو معقول طریقے سے یہ سمجھانے کی بالکل گنجائش ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے رویے میں تبدیلی لائے اور دوسرے فریق کے ساتھ خوشگوار زندگی گزارے۔

(3) اگر سرد مہری، چاہت میں کمی، لاف زنی یعنی بیہودہ زبان کا استعمال، بیگانگی و بے رخی اس درجہ تک پہنچ جائے کہ دوسرے فریق کے لیے ناقابل برداشت ہو جائے۔

(4) ظلم یا بے رحمی ایک مخصوص دماغی کیفیت کی طرف اشارہ کرتی ہے جس میں ایک فریق کا رویہ مستقل ایسا رہے کہ اس سے دوسرے فریق کو ذہنی تکلیف ہو، وہ مایوسی کا شکار ہو اور ایسی صورتحال ایک طویل عرصے تک جاری رہے۔

(5) اگر دوسرے فریق کو ایذا رسانی کی نیت سے اور اس کی زندگی اجیرن بنانے کے لیے بیہودہ اور ناروا برتاؤ کیا جائے۔

(6) اگر دوسرے فریق کے ساتھ مستقل ایسا نازیبا برتاؤ کیا جائے کہ جس سے اس کی جسمانی و ذہنی صحت پر منفی اثر پڑے۔ یہ رویہ اس وقت ناروا سمجھا جائے گا جب اس سے پیدا ہونے والا خطرہ یا خدشہ نہایت شدید اور دشوار گزار ہو۔

(7) پیہم نازیبا رویہ، جان بوجھ کر غفلت، عام ازدواجی زندگی کے اصولوں اور مراسم ازدواجی سے مکمل دوری اور یہاں تک کہ ایذا رسانی سے لطف اندوزی یعنی کسی کو ستانے میں مزہ آنا۔

(8) محض حاسدانہ، خودغرضانہ یا حاکمانہ رویہ جس سے اس قسم کی صورت حال پیدا ہو جائے جس میں نہ خوشی ہو اور نہ سکون اور اس کا نتیجہ محض ذہنی کلفت واذیت ہو تو اس بنیاد پر طلاق نہیں لی جا سکتی۔

(9) روزمرہ کی چھوٹی موٹی باتوں اور معمولی تنازعات کی بنیاد پر اسے ذہنی بے رحمی یا ظلم کہہ کر طلاق حاصل نہیں دی جا سکتی۔

(10) ازدواجی زندگی کا ایک طویل مدتی جائزہ لیا جانا چاہیے نہ کہ اکا دکا واقعات کا۔ ناروا رویہ طویل مدتی ہو اور حالات اس قدر بگڑ جائیں کہ کسی ایک فریق کے کسی فعل اور بدسلوکی کے باعث ایک دوسرے کے ساتھ رہنا نہایت دشوار ہو جائے۔

(11) اگر شوہر اپنی بیوی کی مرضی کے بغیر اور اس کے علم میں لائے بغیر نسبندی کراتا ہے یا بیوی بھی اس طرح کا عمل کرتی ہے یا اسقاط حمل کراتی ہے۔

(12) بغیر کسی جسمانی کمزوری یا جائز وجہ کے جنسی مباشرت نہ کرنے کا یکطرفہ فیصلہ۔

(13) شوہر یا بیوی کا شادی کے بعد بچہ نہ پیدا کرنے کا یکطرفہ فیصلہ۔

(14) جہاں ایک طویل عرصے تک دونوں ایک دوسرے سے پیہم جدا رہیں اور یہ نتیجہ اخذ کرنے کی معقول وجہ ہو کہ ان کے ازدواجی تعلقات میں سدھار ناممکن ہے۔

جسمانی مظالم

جہیز، گھریلو تشدد، طلاق، تنسیخ ازدواج میں قانون کی رو سے شوہر کا وہ کردار ایک قانونی بے رحمی ہے جو عورت کی زندگی، صحت وعافیت کے لیے خطرہ بن جاتا ہے یا ایسے خطرے کا معقول امکان پیدا کرتا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے بے رحمی دو قسم کی ہوتی ہے، ایک ذہنی بے رحمی یا ظلم اور دوسری جسمانی بے رحمی یا ظلم ۔ مجموعہ تعزیرات بھارت کی دفعہ 304(ب) اور دفعہ 498(الف) کے تحت بے رحمی یا ظلم ایک عام لازمی عنصر ہے۔ ظالمانہ رویہ کسی بھی عورت کو خودکشی کرنے پر مجبور کر سکتا ہے یا اس سے اس کی جان، جسم کے کسی حصے یا صحت کو شدید مضرت پہنچ سکتی ہے۔ یہ مضرت ذہنی بھی ہو سکتی ہے، جسمانی بھی ہو سکتی ہے یا دونوں ہو سکتی ہیں۔ مجموعہ تعزیرات بھارت کی مختلف دفعات کی رو سے لفظ مضرت سے ایسا ضرر یا تکلیف مراد ہے جو کسی طرح بھی غیر قانونی طور پر کسی شخص کے جسم یا دماغ یا نیک نامی یا جائیداد کو پہنچا ہو۔

کیرالہ ہائی کورٹ نے بھی دیوسپا بنام ریاست کیرالہ والے معاملے میں (2006، کریمنل لاء جرنل 3480 ص 3483 (کیرالہ) یہ فیصلہ دیا ہے کہ دفعہ 498 الف سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر شوہر کا ہرگز یہ ارادہ نہ ہو کہ وہ اپنی بیوی کو خودکشی کرنے پر مجبور کرے تو یہ دفعہ 498 الف کے دائرے میں نہیں آئے گا کیونکہ اس دفعہ کے اطلاق کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایسا جان بوجھ کر کیا جائے۔

شوبھا رانی بنام مدھوکر ریڈی والے معاملے میں (اے آئی آر 1988 ایس سی 121 ص 127) سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ جہیز کی مانگ ظلم کے زمرے میں آتی ہے۔ یہاں مجموعہ تعزیرات بھارت کی متذکرہ بالا دفعہ 304(ب) کا حوالہ وجائزہ لینا بھی ضروری ہے:

جہیز موت (Dowry Death) اور خواتین کے ساتھ ظالمانہ سلوک سے متعلق جرائم

جہیز موت

304ب: (1) جہاں کسی عورت کی موت جلا ڈالنے یا جسمانی ضرر کے باعث واقع ہوتی ہے یا اس کی شادی کے 7 سال کے اندر عام حالات سے مختلف صورت حال میں ہوجاتی ہے اور یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ اس کی موت سے ذرا قبل اس کے شوہر نے یا اس کے شوہر کے کسی رشتہ دار نے جہیز کی کسی مانگ کے لیے یا اس کے متعلق اس کے ساتھ بے رحمی کی تھی یا اسے تنگ کیا تھا وہاں ایسی موت کو جہیز موت کہا جائے گا اور ایسے شوہر یا رشتہ دار کی بابت یہ سمجھا جائے گا کہ وہ موت کا باعث بنا ہے۔

تشریح: اس ذیلی دفعہ کی اغراض کے لیے "جہیز" کے وہی معنی ہیں جو ممانعت جہیز ایکٹ 1961 (ایکٹ نمبر 28 بابت 1961) کی دفعہ 2 میں ہیں۔

(2) جو کوئی جہیز موت کا ارتکاب کرتا ہے اس کو قید کی جس کی میعاد 7 سال سے کم کی نہیں ہوگی، لیکن جو عمر قید تک کی ہوسکے گی، سزا دی جائے گی۔

تبصرہ

دشرتھ بنام ریاست مدھیہ پردیش (2011(72) اے سی سی 215 ایس سی سی) اور کتنے ہی دیگر معاملوں میں یہ فیصلہ دیا گیا ہے کہ اگر متوفیہ کے ساتھ غلط برتاؤ کیا گیا، اسے جسمانی اور ذہنی طور پر ہراساں کیا گیا اور یہ کہ رشتۂ ازدواج صحیح طرح سے نہیں چل پایا اور یہ کہ کم تحائف اور کم نقدی دینے کا الزام لگایا گیا اور یہ کہ متعلقہ فریق کی موت شادی کے سات سال کے اندر ہوگئی تو اس صورت میں ملزم کو اس دفعہ کے تحت جہیز موت کا مرتکب قرار دیا جائے گا۔

□□□

Khwaja Abdul Muntaqim

2-I.P Extn.

Delhi-110092

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.............................. بتاریخ..............................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی

اُردو رُباعی میں شرنگار رَس اور نسوانی رُوپ

چند برس قبل خاکسار نے بیت بازی کے علمی کھیل کو زیادہ دلچسپ اور اس میں کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے ''گنجینۂ رباعیات'' نام کا مجموعہ اولان اور دیوان کے طرز پر مرتب کیا تھا۔ اُن رباعیات میں تمام حروف تہجی (ژ اور ڑ کو چھوڑ کر) ابتدا اور انتہا دونوں جگہ لانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس منفرد مجموعہ کے لیے مطلوبہ رباعیات کی تلاش میں پچاسوں قدیم وجدید رباعی گو شعرا کے کلام کو کھنگالنا پڑا۔ اس وقت بندہ کے علم میں یہ بات آئی کہ چار مصرعوں اور بحر ہزج کے چوبیس اوزان کے دائرہ میں رہ کر رُباعی نام کی مختصر نظم میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے رباعی گو شعرا حُسن وعشق کی واردات کو سمونے کا زیادہ اہتمام نہ کرتے تھے جبکہ سنجیدہ عناوین اور اخلاقی درسیات کو شامل کرنے کو اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ بندہ نے محسوس کیا کہ 18/ویں صدی کے شیر علی افسوس اور انشاء اللہ خاں انشاء نیز 9/ویں صدی کے مومن اور امیر مینائی جیسے بیباک شعرائے کرام نے بھی اپنی عاشقانہ رباعیات میں بڑا محتاط رویہ رکھا ہے اور نرم لب ولہجہ اختیار کیا ہے۔ مثلاً:

تیرے لیے ہم نے اک خدائی چھوڑی
پر تو نے ذرا نہ بے وفائی چھوڑی
کب تک یہ ستم اٹھائیں، گزرے تجھ سے
چل ہم نے بھی تیری آشنائی چھوڑی

(افسوس)

یوں میں نے سُنا کہیں وہ کل ہی جاوے
اس غصہ سے جان کیوں نہ جل ہی جاوے
گھبرا گھبرا کے دم لبوں پر آیا
اُف کیجیے اور بس نکل ہی جاوے

(انشاء)

سُنتا ہوں ہوا جلوہ نُما عید کا چاند
ہے اُس کی جدائی تو گُجا عید کا چاند
وہ ابروئے پُرخم نظر آئے جو مجھے
البتہ یہ سمجھوں کہ ہوا عید کا چاند

(امیر مینائی)

رو رو کے کہا اُس سے ملاقات کی رات
رو رو کے کٹیں ہجر کی راتیں ہیہات
اب ذکر شب وصل ہے احباب سے اور
رونا وہی زار زار یہ ہے کیا بات

(مومن)

بیسویں صدی کے اکثر رُباعی گو شعرا نے رباعی کے ناصحانہ اور متصوفانہ دائرے کو مختلف زاویوں سے وسعت عطا کی۔ مثلاً سیماب اکبر آبادی نے اس میں قومی وملکی مسائل سے بھی کلام کیا:

ہر نفس پریشان ہے اور کچھ بھی نہیں
جھگڑے ہیں اور انسان ہے اور کچھ بھی نہیں
تھی وسعتِ عالم کبھی جنّتِ یکتا
اب جنگ کا میدان ہے اور کچھ بھی نہیں

انقلابی شاعر جوش ملیح آبادی کی رُباعیات میں اخلاقی درسیات اور رومانی جذبات کی جگہ انقلابی لہجہ کی کھنک واضح طور پر سنائی دیتی ہے:

گرداب سے کھیل کر اُبھرنے والے
ممنوع شجر سے اے نہ ڈرنے والے
اس ارض کا تحفۂ خلافت ہو قبول
فردوس میں اے گناہ کرنے والے

بلا شبہ محشر عنایتی رامپوری وہ پہلے رُباعی گو شاعر ہیں جنھوں نے اپنی رُباعیات میں دیہات کی عورت کے حُسن، وفاشعاری اور جفاکشی کو خاص جگہ دی مثلاً ذیل کی رُباعیات دیکھیں

بازو تھرکیں تو مونڈھے پھڑکیں لچکیں
شرائوں کے ساتھ ساتھ بانہیں لچکیں
جب سانجھ سویرے گائے دوہے گوری
صندل کی، ہوا میں جیسے شاخیں لچکیں

بوسیدہ سے کپڑوں میں جوانی کا سجاؤ
الجھے ہوئے بالوں میں قیامت کا بناؤ
گوری میں تکلف ہے، نہ تصنّع، لیکن
زاہد بھی جو دیکھے تو کہے مجھ کو بچاؤ

جاگے تو قیامت سی اُٹھاتی جائے
چکّی پیسے تو گنگناتی جائے
بادل کی میں جیسے دھیرے دھیرے
جوگن کوئی بانسری بجاتی جائے

محشر عنایتی

جب کہ جاں نثار اختر نے بیوی کو محبوبہ کے روپ میں پیش کر کے گھر آنگن کا عمدہ نقشہ کھینچا:

آہٹ مرے قدموں کی سُنی تو اُس پل

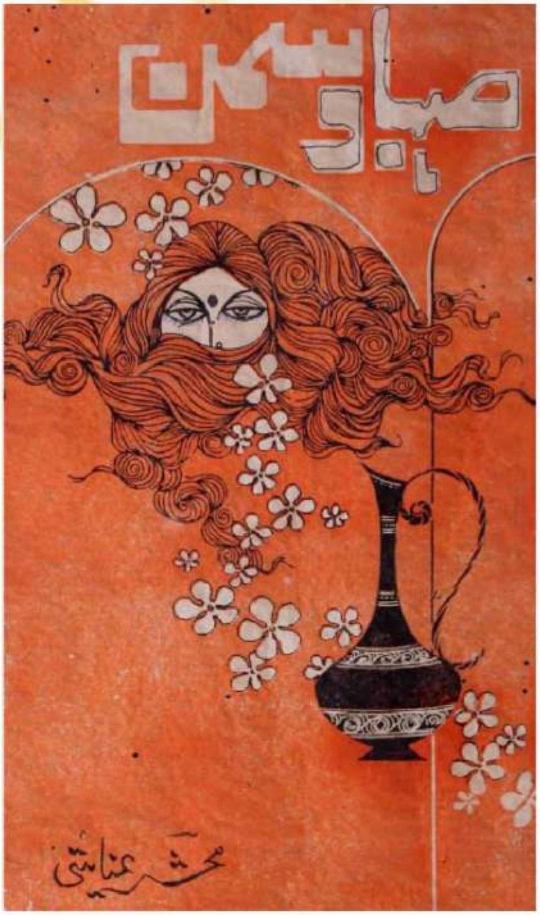

سوئی ہوئی بن کے پڑ گئی ہے چنچل
تلوؤں میں جو جاکے گدگدایا میں نے
چہرے سے اُلٹ دیا ہے ہنس کر آنچل

یہ تیرا سجاؤ، یہ سلیقہ، یہ روپ
لہجے کی یہ چھاؤں، گرم جذبوں کی یہ دھوپ
سیتا بھی، شکنتلا بھی، رادھا بھی تو ہے
یگ یگ سے بدلتی چلی آئی ہے تو روپ

جاں نثار اختر

بیسویں صدی کے جن شعرا نے رباعی کو طرزِ کہن سے نکال کر آئینِ نو سے روشناس کرایا اُن میں فراق گورکھپوری سب سے زیادہ نمایاں ہیں انھوں نے اپنی علمی اور فنّی بصیرتوں کو بروئے کار لا کر شرنگار (سنگھار) رس میں تخلیق کی گئی 351/رباعیات کے ذریعہ اُردو کے شعری ادب میں نہ

صرف قابل قدر اضافہ کیا بلکہ اپنے قد کو بڑا بلند بھی کر لیا۔ فراق نے ''روپ'' نام سے شائع مجموعۂ رباعیات میں بڑی چابکدستی سے عام ہندوستانی عورت کے حُسن، فراق اور وصال کے جذبات نیز اس کی محبت، وفاداری اور روزمرہ کی زندگی سے وابستہ رسم ورواج کو اس طرح نظم کیا ہے کہ تشبیہات اور تلمیحات کے توسط سے ہندو اساطیری پیکروں کا بڑا عمدہ تعارف بھی ہوگیا ہے۔ فراق نے ''روپ'' کے دیباچہ میں واضح طور پر یہ کہا ہے کہ اُردو شاعری صحیح معنوں میں ہندوستانی شاعری نہیں بن سکی کیونکہ اس میں ہندوستانی قدروں کا فقدان رہا ہے اور یہ کہ انھوں نے ''روپ'' کی رباعیات اسی کمی کو دور کرنے کی غرض سے تخلیق کی ہیں۔

قدیم ہندی شاعری میں شرنگار (سنگھار) رس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ آچاریوں یعنی اساتذہ نے شرنگار رس کو رس راج کہا ہے یعنی دیگر تمام رسوں کی تخلیق شرنگار رس سے ہونا تسلیم کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عورت اور مرد کے عشقیہ جذبات سے متعلق تمام باتیں شرنگار رس کے ہی دائرے میں آتی ہیں۔ سنسکرت اور ہندی کے آچاریوں نے

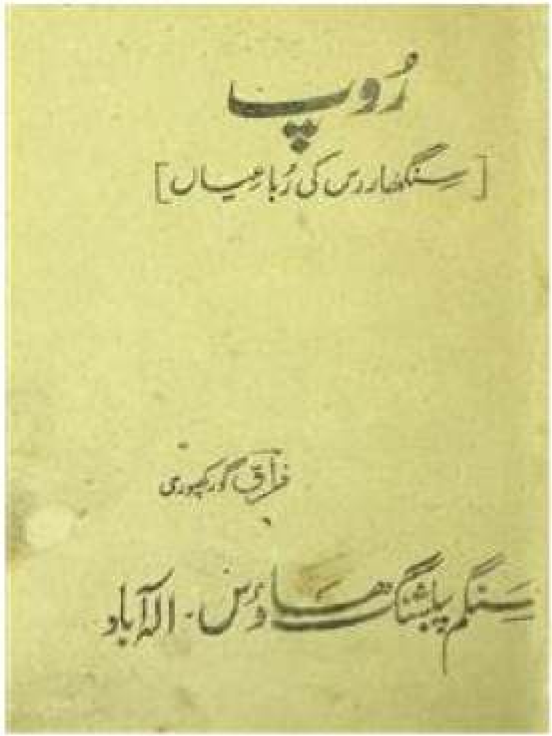

''کام'' یعنی جنسی جذبہ کو بھی شرنگار رس کا حصہ بتایا ہے اور ''کام'' کو انسان کی اہم ترین اور پسندیدہ ضرورت تسلیم کیا ہے۔ اسی لیے اس جذبہ کو عظیم تصور کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ دیوی دیوتا بھی اس جذبہ سے مبرا نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ کام دیو کا تصور اسی جذبہ کی پیداوار ہے۔ اسی لیے ہندوستانی تہذیب میں جنسی اتصال کو ہوس پرستی اور عریانیت کے زمرے میں نہیں گردانا گیا ہے بلکہ اس کو تقدس اور طہارت کا درجہ حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اجنتا ایلورا کی گپھاؤں میں سنگ تراشی کے ذریعہ پیش کیے گئے جنسی اتصال کے نمونے جنسی پاکیزگی کے مظہر سمجھے جاتے ہیں۔ اسی لیے فراق نے اپنے مجموعۂ رباعیات ''روپ'' میں ہندوستانی عورت کے حسن و جمال، ناز وادا، رومانی جذبات وخیالات، فراق اور وصال، خود سپردگی، محبت، وفا شعاری اور روزمرہ کی زندگی کی مصوری کے لیے ہندو دیوی دیوتاؤں، مخصوص ندیوں، تیوہاروں اور مذہبی وسماجی رسومات کو تمثیلات، استعارات اور تلمیحات کے ذریعہ عمدگی سے شامل کیا ہے۔

ہندو عقیدے کے مطابق گنگا کو آفاقی مخلوق مانا گیا ہے اور جب وہ آسمان سے زمین کی جانب رواں ہوئی تو شیو جی نے اس کو اپنی جٹاؤں میں روکا اور پھر آگے بڑھنے دیا۔ اس عقیدہ کی ترجمانی فراق نے تلمیحی انداز میں ذیل کی رباعی میں کی ہے:۔

جب پریم کی گھاٹیوں میں ساغر اچھلے
جب رات کی وادیوں میں تارے چھلکے
نہلاتی فضا کو آئی رس کی پتلی
جیسے شیو کی جٹا سے گنگا اُترے

ایک دوسرے عقیدے کے مطابق سمندر منتھن کے نتیجے میں برآمد ہوئے زہر سے دنیا کو محفوظ رکھنے کی خاطر شیو جی نے اس کو پی لیا تھا۔ بقول فراق زہر کے پیالے کو ہاتھوں میں لیتے وقت شیو جی کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں اور ہاتھوں پر لرزہ طاری ہوگیا تھا۔ اس واقعہ کو بڑی عمدگی سے معصوم اور وفا شعار ہندوستانی عورت کے لیے ذیل کی رباعی میں سمویا گیا ہے:

وہ ہونٹ ڈرے ڈرے نگاہوں سے دعا
معصوم آنکھوں میں اشک چھلکا چھلکا
زہر آبِ وفا کو حسن کرتا ہے قبول
یا وِس کا پیالہ شیو نے ہاتھوں میں لیا

اسی طرح صبح کی دیوی ''اوشا'' کے حُسن کو بطور تشبیہ سموتے ہوئے حُسنِ ارضی سے متعلق یہ رُباعی تخلیق کی گئی:

پلکوں سے پڑ رہی ہے امرت کی پھوار
جوبن میں بسنت کی ترنگوں کا ابھار
یہ دیپ شکھا سی ناک، کلیلا سے ادھر
وہ رنگ کہ کررہی ہے اوشا شرنگار

سچے عشق کی عکاسی کرنے والے شری کرشن اور اُن کی محبوبہ رادھا نیز اُن سے متعلق مدھوبن اور گوکل کی بستیوں کا ذکر بطور تمثیل کرتے ہوئے تخلیق کی گئی یہ رُباعی بھی ملاحظہ کریں:

مدھوبن کے بسنت سا لجیلا ہے وہ روپ
برکھا رُت کی طرح رسیلا ہے وہ روپ
رادھا کی جھپک کرشن کی برزوری ہے
گوکل نگری کی راس لیلا ہے وہ روپ

شری کرشن کی طرح رام چندر جی کو بھی اوتار مانا گیا ہے۔ اُن کا اور اُن کی بیوی سیتا نیز اُن کی شادی کا نقشہ بھی کئی رباعیات میں کھینچا گیا ہے۔ سیتا جی جب جنک کے باغ میں اپنی شرگیں نگاہوں کے ساتھ ٹہلتی تھیں تو اُن کی آنکھوں سے کامنی کے سفید پھول جھڑنے کو ذیل کی رباعی میں کس خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے:

خوشبو سے مشام آنکھوں کے بس جاتے ہیں
غنچے سے فضاؤں میں بکس جاتے ہیں
جھکتی ہے تری آنکھ سرِ خلوتِ ناز
یا کامنی کے پھول برس جاتے ہیں

ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ شرنگار رس میں صرف عورت کے حسن اور اداؤں کا ہی ذکر نہیں ہوتا بلکہ اس میں جنسی جذبات و معاملات کا برملا اظہار بھی ہوتا ہے۔ فراق کی رباعیات میں ہندوستانی عورت اپنی نشیلی آنکھوں میں پوشیدہ کہانیاں لیے ہوئے تاروں کو لوریاں سُناتی ہے اور کامنی کے پھول برساتی ہے اور یہی عورت سہاگ رات میں نرم سیج پر اپنے گیسو بکھرائے تمام رعنائیوں اور نزاکتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے حسن اور اداؤں سے محبت کے دیوتا کام دیو کو بھی بیحد متاثر کرتی ہے۔ کام دیو سے متعلق یہ دو رباعیاں ملاحظہ فرمائیں:

ہونٹوں میں وہ رس کہ جس پہ بھونرا منڈلائے
سانسوں کی وہ سیج جس پہ خوشبو سوجائے
چہرے کی دمک پہ جیسے شبنم کی ردا
مد آنکھوں کا کام دیو کو بھی جو جھپکائے

وہ روپ کہ کام دیو جس کا ہو شکار
وہ رنگ اُوشا نے جیسے چھیڑا ہو ستار
وہ ہونٹوں کا رس، جانِ طراوت ہر بوند
وہ گات کہ سر سے ایڑیوں تک چمکار

ہندو مذہب میں شادی اسی وقت مکمل ہوتی ہے جب دولہا اور دلہن کے ملبوسات میں گانٹھ باندھ کر اُن کو خوشبو پھیلائے ہوئے اگنی کنڈ (آگ کے الاؤ) کے گرد سات پھیرے کرائے جاتے ہیں۔ اس رسم کو بھانور کہتے ہیں۔ ہندوستانی عورت کے اس روپ کی عکاسی اس رباعی میں کی گئی ہے:

منڈپ کے تلے کھڑی ہے رس کی پُتلی
جیون ساتھی سے پریم کی گانٹھ بندھی
مہکے شعلوں کے گرد بھانور کے سمے
مکھڑے پہ نرم چھوٹ سی پڑتی ہوئی

آیئے اب اپنے ساجن یا محبوب کے فراق سے پہنچنے والے کرب سے متعلق رباعیات دیکھ لیں:

آنسو سے بھرے بھرے وہ نینا رس کے
ساجن کب اے سکھی تھے اپنے بس کے
یہ چاندنی رات، یہ برہ کی پیڑا
جس طرح اُلٹ گئی ہو ناگن ڈس کے

چہرے پہ ہوائیاں نگاہوں میں ہراس
ساجن کے برہ میں روپ کتنا ہے اُداس
مکھڑے پہ دھواں دھواں لٹاؤں کی طرح
بکھرے ہوئے بال ہیں کہ سیتا بن باس

تشبیہ اور استعارہ سے مزین اپنے محبوب شوہر یا پریمی کی جدائی پر

ایک پریمکا کے تڑپنے کی کس قدر حسین منظر کشی مذکورہ بالا رباعیات میں موجود ہے اور اب وصال کے نمونے بھی ملاحظہ کریں:

یہ راز و نیاز اور یہ سے خلوت کا
یہ آنکھ میں آنکھ ڈال دینا تیرا
ہرنی ہے ڈری ڈری سی اور کچھ مانوس
یہ نرم جھجک ، سپردگی کی یہ ادا

جب پچھلے پہر پریم کی دنیا سولی
کلیوں کی گرہ پہلی کرن نے کھولی
جوبن رس چھلکاتی اٹھی چنچل نار
رادھا گوکل میں جیسے کھیلے ہولی

مذکورہ بالا دونوں رباعیات میں وصل کی واضح تصویر پیش کی گئی ہے۔ گوکل میں رادھا کے ہولی کھیلنے کی مثال نے رباعی کے حُسن کو دوبالا کردیا ہے۔

'روپ' کی رُباعیات میں فراق نے عورت کو صرف حُسن کی دیوی اور جنسی تسکین کا سامان قرار نہ دے کر اس کو ماں، بیٹی، بہن، بیوی ہر روپ میں پیش کیا ہے۔ عورت کو ماں کے روپ میں پیش کی گئی یہ دو رباعیات دیکھیں:

آنگن میں ٹھنک رہا ہے ضدیایا ہے
بالک تو ہئی، چاند پہ للچایا ہے
درپن اسے دے کے یہ کہتی ہے ماں
لے آئینہ میں چاند اتر آیا ہے

آنگن میں لے چاند کے ٹکڑے کو کھڑی
ہاتھوں میں جھلاتی ہے اُسے گود بھری
رہ رہ کے ہوا میں جو ٹہوکا دیتی
گونج اٹھتی ہے کھلکھلاتے بچے کی ہنسی

ماں کی شفقت و محبت اور بچے کی ضد کو فراق نے جس دل نشیں انداز میں مذکورہ بالا رباعیوں میں پیش کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ طفلانہ معصومیت اور ماں کی فطری محبت کی ایسی حسین منظر کشی دوسرے شعرا کے یہاں بمشکل ہی ملے گی۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ اس قدیم ہندو خیال کہ عورت ہر روپ میں پوجنے کے لائق ہے، کو فراق نے کس ہوشیاری سے رُباعی کا جامہ پہنایا ہے:

ہے بیاہتا پر روپ ابھی کنوارا ہے
ماں ہے پر ادا جو بھی ہے دوشیزہ ہے
وہ مود بھری ، مانگ بھری ، گود بھری
کنیا ہے ، سہاگن ہے ، جگت ماتا ہے

ہندوستانی عورت کا ایک اہم روپ وہ ہے جس میں وہ ایک وفا شعار بیوی اور اپنے شوہر کی محبوبہ ہی نہیں بلکہ اُس کے عاشق کا کردار ادا کرتی ہے۔ اس روپ کی عکاسی کرتی ہوئی یہ رباعی ملاحظہ کریں

پریمی کو بخار ، اٹھ نہیں سکتی پلک
بیٹھی سرہانے ، ماند مکھڑے کی دمک
جلتی ہوئی پیشانی پہ رکھ دیتی ہے ہاتھ
پڑجاتی ہے بیمار کی آنکھ میں ٹھنڈک

جنسی جذبات کی تسکین ایک فطری جذبہ ہے۔ ہندوستانی عورت اپنی تمام تر شرم و حیا کے باوجود اس جذبہ کو یکسر کچل نہیں سکتی اور اس کی تسکین کے جائز مواقع میسر ہوں تو بے جا شرم و حیا میں مبتلا رہنا قطعی جائز نہیں۔ درج ذیل رباعی میں فراق نے عورت کے اس روپ کو بھی بڑی خوبصورتی سے اُجاگر کیا ہے:

جب تاروں نے جگمگاتے نیزے تولے
جب شبنم نے فلک سے موتی رولے
کچھ سوچ کر خلوت میں بصد ناز اُس نے
نرم انگلیوں سے بند قبا کے کھولے

سطور بالا میں نسوانی روپ کی رباعیات کا جو اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے وہ یہ باور کرانے کے لیے کافی ہے کہ یہ رباعیات اپنے مضامین کے تنوع اور ایک مثالی ہندوستانی عورت کے رنگا رنگ روپ پیش کرنے کے اعتبار سے اُردو کے شعری ادب میں گرانقدر اضافہ کا باعث ہیں۔ ان رباعیات میں جس خوبصورتی سے ہندو اساطیری کرداروں اور ریتی رواجوں کو سمویا گیا ہے اور ہندی کے برمحل الفاظ کے استعمال سے جس طرح ان کے حُسن اور تغزل میں چار چاند لگائے گئے ہیں اس نے فراق کو وہ شاعرانہ بلندی عطا کی ہے کہ آئندہ زمانہ میں بھی شاید ہی کوئی دوسرا شاعر فراق کی ہمسری کر سکے۔

□□□

Dr. Shamim Ahmad Siddiqui
Naseem Manzil
Midah Ganj Police Chowki
Sitapur Road
Lucknow-226020 (U.P)

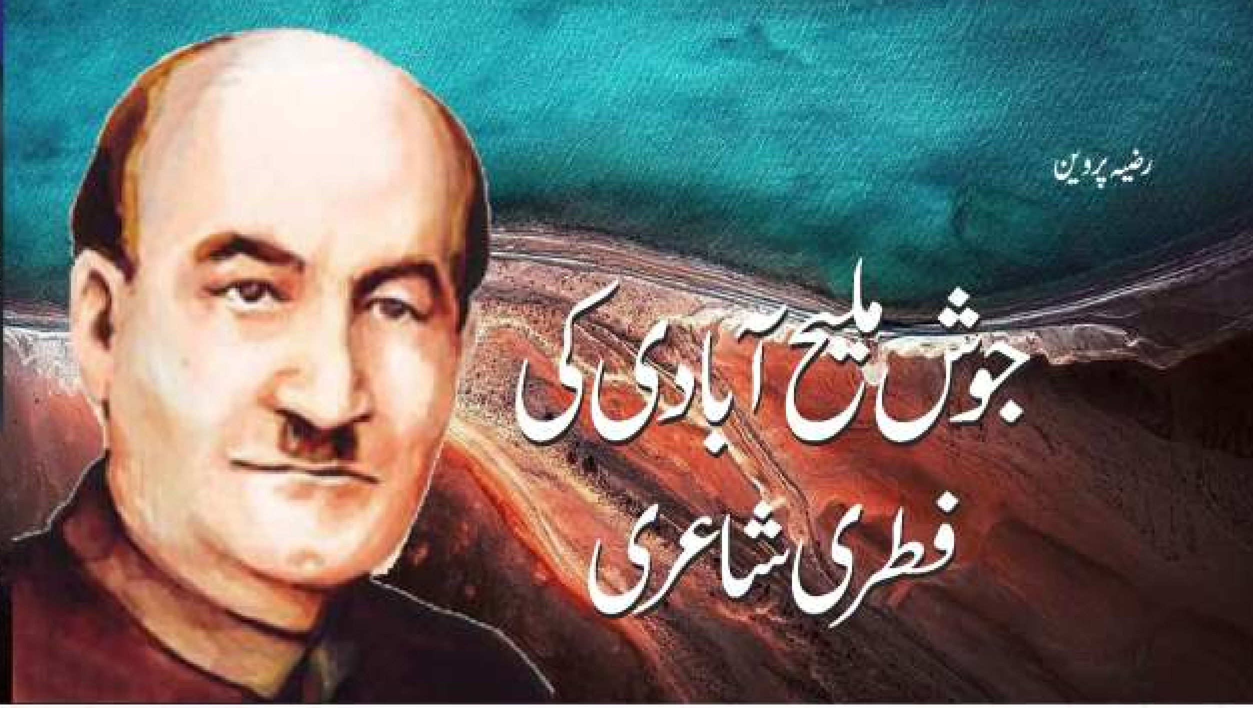

جوش ملیح آبادی کی فطری شاعری

رضیہ پروین

اردو شاعری میں جوش کی نظمیں بے پناہ شہرت و مقبولیت کی حامل ہیں۔ان کی ادبی شخصیت شعر، تنقید، خاکہ، انشاء پردازی اور سوانح نگاری جیسی متنوع جہتوں میں پھیلی ہے۔لیکن جوش نے اردو شاعری خصوصاً اردو نظم پر گہرے اثرات مرتب کیے۔" جوش جیسے شاعر اپنے وقت کی آپ ہی آواز ہوتے ہیں وہ بیسوی صدی کی سب سے بڑی اور عظیم شعری آواز تھے۔ وہ نظم کے جادوگر اور نظم کے قافلہ سالار گردانے جاتے ہیں۔ شاعر انقلاب، شاعر شباب، شاعر رومان، شاعر جذبات، شاعر فطرت اور شاعر اعظم کے خطابات سے نوازے گئے۔" (انتخاب جوش: ص نمبر 7، عصمت ملیح آبادی)

جوش کے یہاں نگارشاتِ فطرت اور حسن فطرت کا ایک جہاں آباد ہے۔اردو کی منظریہ شاعری میں وہ انگریزی کے کیٹس اور پی بی شیلے سے بھی آگے نکل گئے ہیں اور کہیں کہیں تو ان کو مات دیتے بھی نظر آتے ہیں۔ منظر نگاری ان کی شاعری کا خاص وصف ہے جن کا چند صفحات پر احاطہ کرنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا کہ دریا کو کوزے میں بند کرنا۔ان کی نظموں میں بے پناہ روانی، سلاست اور برجستگی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کوئی آبشار مچلتا اور شور مچاتا ہوا اور کہیں کہیں مدھم مدھم سروں میں گنگناتا ہوا آگے بڑھ رہا ہو۔ "نظم سورہ رحمن" میں حسن فطرت کی جولانی دیکھتے ہی بنتی ہے جس میں انسانی زندگی کے رموز و حکایات کو سمجھنے کا فلسفہ بھی نظر آتا ہے:

سبز گہرے رنگ کی بیلیں چڑھی ہیں جابجا
نرم شاخیں جھومتی ہیں، رقص کرتی ہے صبا
پھل وہ شاخوں میں لگے ہیں، دل فریب و خوشنما
جس کا ہر ریشہ قندو شہد میں ڈوبا ہوا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا
صبح کے شفاف تاروں سے برستی ہے ضیا
شام کو رنگ شفق کرتا ہے ایک محشر بپا
چودویں کے چاند سے بہتا ہے دریا نور کا
جھوم کر برسات میں اٹھی ہے متوالی گھٹا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

جوش نے مناظر قدرت کو بڑی مہارت اور چابک دستی کے ساتھ اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔صبح کی منظر کشی کتنے دلکش پیرائے میں کی ہے جس کی مثال کم یاب ہے:

نظر جھکائے عروسِ فطرت جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے
سحر کا تارا ہے زلزلے میں، افق کی لو تھر تھرا رہی ہے
روش روش نغمۂ طرب ہے، چمن چمن جشنِ رنگ و بو ہے
طیور شاخوں پہ ہیں غزل خواں کلی کلی گنگنا رہی ہے
ستارۂ صبح کی رسیلی جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے
نگار مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے
کلی پہ بیلے کی کس ادا سے پڑا ہے شبنم کا ایک موتی
نہیں یہ ہیرے کی کیل پہنے کوئی پری مسکرا رہی ہے
(نظم البیلی صبح)

پروفیسر محمد حسن رقم طراز ہیں:

" مناظرِ فطرت کی جو پر جوش اور پر کیف عکاسی ان کے یہاں ملتی ہے اس کی نظیر ہمارے یہاں کم ہے۔۔ جو مردوں

میں جان، جذبات میں طوفان بپا کردے اور اہلِ نظر کو ثبوت حق پہنچادے۔"

ویسے دیکھا جائے تو جوش فطری طور پر نظم کے شاعر ہیں مگر اپنی شاعری کا آغاز انھوں نے غزل سے کیا ہے اور اسے نئے رنگ و آہنگ اور نیا لب ولہجہ عطا کیا۔ مگر جوش کا اصل جوہر ان کی نظموں میں ملتا ہے۔ حسن و عشق ان کی شاعری کے محبوب موضوعات ہیں وہ حسن کے شیدائی ہیں حسن ان کو اپنی طرف کھینچتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ حسن کی بارگاہ میں اپنا سب کچھ قربان کردینے پر راضی نظر آتے ہیں "جنگل کی شہزادی" اور فتنۂ خانقاہ" اس کی بہترین مثالیں ہیں:

خورشید چھپ رہا تھا رنگیں پہاڑیوں میں
طاؤس پر سمیٹے بیٹھے تھے جھاڑیوں میں
کچھ دور پر تھا پانی، موجیں رکی ہوئی تھیں
تالاب کے کنارے شاخیں جھکی ہوئی تھیں
لہروں میں جیسے کوئی دل کو ڈبو رہا تھا
میں سو رہا ہوں ایسا محسوس ہورہا تھا
ایک موج کیف پرور دل سے گزر رہی تھی
ہر چیز دلبری سے یوں رقص کر رہی تھی

(از جنگل کی شہزادی)

ساون کا ابر، کاکلِ شب گوں کے دام میں
موجیں شراب سرخ کی آنکھوں کے جام میں
رنگ طلوعِ صبح، رخ لالہ فام میں
چلتا ہوا شباب کا جادو خرام میں
انساں تو کیا یہ بات پری کو ملی نہیں
ایسی تو چال کبکِ دری کو ملی نہیں

(فتنہ خانقاہ ص 15)

جوش کے اشعار دلوں میں تڑپ اور احساس پیدا کرنے والے ہیں۔ بے شمار ایسے اشعار ہیں جس میں زندگی چلتی پھرتی اور دوڑتی نظر آتی ہے۔ کچھ اشعار تو ایسے ہیں جس میں مکمل زندگی کا نقشہ ہی اتار کر رکھ دیا ہے۔ زندگی کے جذباتی پہلو بھی ان کے کلام میں خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہیں لیکن وہ جب حسن فطرت اور مناظر قدرت کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں وہ پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔ نظم "گرمی اور دیہاتی بازار" میں دیہات کے دوپہر کی منظر کشی کے ساتھ ساتھ جذبات کی عکاسی بھی بڑے مؤثر انداز میں کی گئی ہے:

دوپہر، بازار کا دن، گاؤں کی خلقت کا شور
خون کی پیاسی شعاعیں ، روح فرسا لو کا زور
آگ کی رو کاروبار زندگی کا پیچ و تاب
تند شعلے، سرخ ذرے، گرم جھونکے، آفتاب
شور، ہلچل، غلغلہ، ہیجان، لو، گرمی، غبار
بیل، گھوڑے، بکریاں، بھیڑیں قطار اندر قطار
مکھیوں کی بھنبھناہٹ، گڑ کی بو، مرچوں کی دھانس
خربزے آلو، گھلی، گیہوں، کدو، تربوز، گھانس

(از۔گرمی اور دیہاتی بازار)

جوش کو قدرتی مناظر اپنی طرف پوری شدت سے کھینچتے ہیں جب وہ نظارہ فطرت میں محو ہو کر نغمہ سرائی کرتے ہیں تو قاری کو اور ہی دنیا میں پہنچا دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جوش کی شاعری کا احاطہ انقلاب و رومان و شباب کے پس منظر کے ساتھ ساتھ فطری جمالیات کو ساتھ رکھ کر نہ کیا جائے گا تو اس وقت تک صحیح نتیجے پر پہنچنا ممکن نہیں۔ اگرچہ انھوں نے مختلف موضوعات پر قلم فرسائی کی ہے مگر مناظر فطرت اور کمالات قدرت کو جس خوبی وخوبصورتی سے انھوں نے پیش کیا ہے وہ نہایت اہم ہیں:

روح شاعر آج پھر ہے، وجد میں آئی ہوئی
آم کے باغوں میں ہے کالی گھٹا چھائی ہوئی
مست بھنورا گونجتا پھرتا ہے کوہ و دشت میں
روح پھرتی ہے کسی وحشی کی گھبرائی ہوئی
غنچہ غنچہ اپنے فطری رنگ میں ڈوبا ہوا
پتی پتی اپنے اصلی رنگ پر آئی ہوئی
خار صحرا فیض ابرو باد سے نکھرے ہوئے
خاک گلشن ، موج رنگ و بو سے اترائی ہوئی

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ایک ایک لفظ سے جادوئی کیفیت اور سحر وجدانی قاری کے ذہن ودماغ پر ثبت ہوتی ہے۔ بقول پروفیسر محمد حسین:

" جوش کا کلام لفظوں کی انمول اور بے مثال قوس قزح ہے، رنگ احساس تصور کا ایسا خزانہ ہے جس کی مثال سودا نظیر اور انیس کے علاوہ ہزار سال کے اردو ادب میں ناپید ہے۔"

(قومی آواز کام۔23 فروری 2018)

جوش کے کلام نے تصویر کاری ومصوری کے ساتھ ساتھ احساس انسانی کو بھی سمودیا ہے۔ جس کی مثالیں شاذونادر ہی نظر آتی ہیں۔

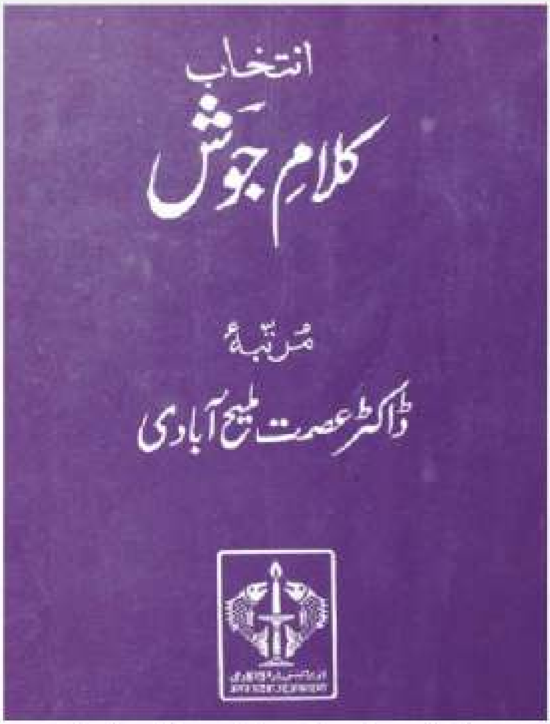

جوش قدرت کے ہر موسم، ہر رنگ، ہر ادا کو محسوس کرتے ہیں اور اپنی فنکارانہ صلاحیت اور شعری بصیرت کی بنا پر اس درجے کی تصویر کشی کرتے ہیں کہ وہ منظر ہماری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں اور ایک نئے لب و لہجے اور رنگ و آہنگ سے اپنے شعری کلام کو آراستہ کرتے ہیں۔ نظم ''الوداع'' کو خاص معنی و مفہوم دے کر اپنے جذبات و احساسات کا آئینہ بنادیا ہے اور جزئیات نگاری سے کام لیتے ہوئے اشعار کو تجزیاتی انداز میں پیش کیا ہے:

آم کے باغوں میں جب برسات ہوگی پر خروش
میری فرقت میں لہو روئے گی چشمِ مے فروش
رس کی بوندیں جب اڑادیں گی گلستانوں کے ہوش
کنج رنگیں میں پکاریں گی ہوائیں ''جوش، جوش''
سن کے میرا نام موسم غمزدہ ہوجائے گا
ایک محشر سا گلستاں میں بپا ہوجائے گا

(نظم الوداع، ص26)

جوش کی شاعری ہمہ جہت ہے، فکر وفن کی نیرنگیاں اور حسن و جمال کی سرمستیاں ان کے کلام کی خاصیت ہے۔ ان کے یہاں حسن فطرت صرف فطرت نگاری نہیں بلکہ حیات و کائنات کے اسرار و رموز کی موشگافی کرتی ہے۔ جنگل کی شہزادی، البیلی صبح، بدلی کا چاند، دھوپ چھاؤں وغیرہ نظمیں محاکات اور پیکر تراشی کا خوبصورت نمونہ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کو برسات، کہسار، صبح و شام، ماہ و خورشید، شبنم اور اس کی بوندیں، دریا، گھٹا، بجلی کی کڑک، چمک بادلوں کی گھن گرج، کوئل کی کوک، آم کے باغ، کوہ و دشت کو اپنی منظریہ شاعری میں پیش کرنے کا ہنر بخوبی معلوم ہے اور اس طرح نئی معنویت عطا کر کے حیرت و انبساط کی کیفیت پیدا کردیتے ہیں۔

پردہ جو اٹھایا بادل کا، دریا پہ تبسم دوڑ گیا
چلمن جو گرائی بدلی کی، میدان کا دل گھبرانے لگا
ابھرا تو تجلی دوڑ گئی، ڈوبا تو فلک بے نور ہوا
الجھا تو سیاہی دوڑا دی، سلجھا تو ضیا برسانے لگا
کیا کاوشِ نور و ظلمت ہے؟ کیا قید ہے کیا؟ آزادی ہے
انساں کی ترقی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

(از: بدلی کا چاند)

عصمت ملیح آبادی 'انتخاب کلام جوش'، ص8 میں رقم طراز ہیں:

''فطرت نگاری میں جوش زندگی کے آخری ایام تک مسلسل ارتقائی منزلوں کو طے کرتے رہے ہیں۔ وہ فطرت کے پجاری ہیں جسے انھوں نے سینکڑوں رنگوں اور ناموں سے یاد کیا ہے۔ جھرنوں کی جھر جھراہٹ، دریاؤں کی روانی، برسات کی دلفریبیاں، طلوع و غروب کے مناظر کا بیان ان کی سیکڑوں نظموں میں پوری آب و تاب کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ ساون کے ہینے، برسات کی چاندنی، موج باراں، برسات کی شفق، پہلی گھٹا، بہار کی دوپہر، بھیگی رات، برسات کی شام، بہار کا ترانہ، شام کی بزم آرائیاں، البیلی صبح، بدلی کا چاند، اور نغمۂ سحر وغیرہ نظمیں ان کی فطرت نگاری کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔''

بقول پروفیسر آل احمد سرور:

''جوش کی حسن کاری میں کلام نہیں ان کی تشبیہات دلکش اور معنی خیز ہوتی ہیں ان کا تخیل لالہ کار ہے دور رس نہیں.........انسانیت سے اس قدر عمری محبت اور اس کے روشن مستقبل پر یقین محکم نے ان کے کلام میں بڑی آب و تاب پیدا کردی ہے۔

□□□

Razia Parveen

Assistant Professor (URDU)

Government Girls Degree

College,Rampur,U.P.244901

ڈاکٹر حارث حمزہ لون

قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں نسوانی کرداروں کا معاشرتی و نفسیاتی مطالعہ

قرۃ العین حیدر 20 رجنوری 1926 کو علی گڑھ میں پیدا ہوئیں۔ والد سجاد حیدر یلدرم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں رجسٹرار تھے۔ وہ اُردو کے نامور افسانہ نگار اور رومانی میلانات کے معمار تھے۔ والدہ نذر سجاد حیدر بھی بلند پایہ افسانہ نگاروں میں تھیں اور آزادیِ نسواں اور تعلیم نسواں کی تحریکوں کی روح رواں تھیں۔ قرۃ العین حیدر کا بچپن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی فضاؤں میں پروان چڑھا۔ دہرادون اسکول سے انٹر پاس کیا اور پھر لکھنؤ چلی گئیں جہاں ایم۔اے (انگریزی) میں کیا۔ علمی و ادبی ماحول گھر میں ملا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کی علمی و ادبی فضا میں پروان چڑھیں۔ لکھنؤ میں سن بلوغ کو پہنچیں۔ انگریزی ادب کے مطالعے نے ذہن کے دریچے کھول دیے۔ پھر ان کے ناول ''میرے بھی صنم خانے''، ''سفینۂ غمِ دل''، ''آگ کا دریا''، ''چاندنی بیگم'' اور افسانوی مجموعے ''ستاروں سے آگے''، ''شیشے کا گھر''، ''پت جھڑ کی آواز''، ''سیتا ہرن''، ''روشنی کی رفتار'' منظر عام پر آئے۔

اُردو ادب میں فکشن سے متعلق گفتگو کی جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جدید نظریہ فکر اور جدید رجحانات سے متاثر ہو کر جن ناول نگاروں نے ناول نگاری کی دنیا میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان میں ایک منفرد و ممتاز اور نہایت ہی حساس نام قرۃ العین حیدر کا ہے۔ قرۃ العین حیدر ایک ایسی بلند قامت اور ماہر تخلیق کار ہیں جنھوں نے اپنے قلم سے اُردو دنیا کو فنِ ناول نگاری کے بہت سے نادر و نایاب نمونے پیش کیے اور اپنے ناولوں میں عہد قدیم سے لے کر موجودہ صدی تک ہندوستان کے قدیم عہد، عہد وسطیٰ اور عہد جدید کی تہذیب و تمدن پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہیں۔ ان کے یہاں جدید عصری مسائل شد و مد کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ زندگی کے تمام اہم مسائل کو بیان کرنے کے لیے انھوں نے اپنے فن کو ذریعہ بنایا ہے۔ ان کے ناولوں میں عموماً عصری مسائل اور خصوصاً برصغیر کے مسلم گھرانے کے معاشرتی و سماجی حالات کو پیش کیا گیا ہے۔

جہاں تک قرۃ العین حیدر کے ناولوں کی شہرت اور مقبولیت کا تعلق ہے تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے ناولوں میں جدید نفسیات کی وہ اصطلاح جس کو شعور کی رو یعنی Stream of Consciousness کہا جاتا ہے یہ تکنیک ان کے تقریباً سبھی ناولوں میں موجود ہے۔ یہ پہلی خاتون ناول نگار ہیں جنھوں نے اپنے ناولوں میں شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال بہت ہی فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول اپنے موضوع، فنی اسلوب اور تکنیک کے لحاظ سے بہت پیچیدہ اور تہہ دار ہوتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی حقیقت شناسی اپنے ہر ناول میں زندگی کو کچھ الگ زاویہ نگاہ سے دیکھتی ہے اور ان میں نئی جہتیں تلاش کرنے کی سعی کرتی ہے۔ قرۃ العین حیدر ایک ایسی تخلیق کار ہیں جو اپنی تخلیقی صلاحیت سے ناول کی اندرونی ساخت کو دلکش، خوش آہنگ اور بصیرت انگیز بنا دیتی ہیں۔ نیز اس حقیقت کا راز اس کے ماضی میں مضمر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں ماضی اور حال دونوں کا تجزیہ

ایک ساتھ ہوتا ہے۔

یہ اُردو ادب کی پہلی خاتون ناول نگار ہیں جنھوں نے اپنے ناولوں کو جدید فنی خوبیوں سے آراستہ کرنے کے ساتھ ساتھ خواتین کے مسائل کی عکاسی کی ہے۔ ان کے ناول ہندوستانی معاشرہ اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے عکاس ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے یہاں وقت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے نزدیک وقت ایک یونٹ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں ماضی کو حال سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان کے ناولوں میں وقت ایک مجسم شخصیت ہے اور انسان کا رفیق کار معاون ونگراں بھی ہے۔ خود قرۃ العین حیدر نے وقت کے تصور کو اپنے ناول ''میرے بھی صنم خانے'' میں اس طرح پیش کیا ہے:

> ''وقت ایک کارواں ہے جو آگے بڑھتا رہتا ہے۔ ماضی کا افسوس اور فرد کی فکر اس کی رفتار پر اثر انداز نہیں ہوسکتے، نئے دن آتے ہیں، نئی راتیں آتی ہیں، جھکڑ چلتا ہے، آندھیاں اٹھتی ہیں، کسی کو موت آتی ہے اور کسی کو نہیں آتی، نیند بھی نہیں آتی یہ چکر یوں ہی چلتا رہے گا، سب انیشچت ہیں سب دکھی ہیں''

(میرے بھی صنم خانے، قرۃ العین حیدر، ص: 126)

ان کے یہاں یہ نظریہ کار فرما ہے کہ وقت کے تغیر کے ساتھ معاشرے میں تبدیلی رونما ہوتی ہے اور معاشرہ کے بدلنے کے ساتھ ساتھ قدریں بھی بدل جاتی ہیں مگر جو چیز باقی رہتی ہے وہ درد والم اور غم واندوہ کا وہ لمحہ ہے جو فرد کے رشتوں کے درمیان ٹکراؤ پیدا کرتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں تہذیبی وتاریخی شعور نہایت شدت کے ساتھ موجود ہے اس بنا پر ان کے ناول دستاویزی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے ناول ''میرے بھی صنم خانے'' میں ہندوستان کی قدیم تہذیب وتمدن اور رسم ورواج کو کرداروں کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے۔ ''سفینۂ غم دل'' میں ایک ایسی نوجوان نسل کی تہذیب وثقافت کی داستان بیان کی گئی ہے جو خوابوں اور خیالوں کے محل تیار کرتی ہے اور وطن کی تقسیم اس کے بنے بنائے محل کو ایک جھٹکے میں مسمار کر دیتی ہے۔ جب کہ ناول ''آگ کا دریا'' ہندوستان کے تاریخی دستاویز کو پیش کرتا ہے۔ اس ناول میں قرۃ العین حیدر نے ہندوستان کی ڈھائی ہزار سالہ طرز معاشرت اور تہذیب وثقافت سے لے کر موجودہ نئی نسل اور آزادی کے بعد ہندوستان کی نئی روشن خیالی اور نئی تہذیبی زندگی کو کرداروں کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ ناول ''کار جہاں دراز ہے'' کی پہلی جلد ناول نگار کی اپنے آباء واجداد کی کہانی ہے اور دوسری وتیسری جلد میں ناول نگار کے اپنے عہد کے حالات وکوائف کو قلم بند کیا گیا ہے۔ ناول ''آخر شب کے ہمسفر'' بنگالی دیو مالائی سرزمین پر پروان چڑھنے والی دہشت پسندانہ تحریک کے حالات وواقعات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ناول ''گردش رنگ چمن'' زوال پذیر مغلیہ سلطنت اور اعلیٰ ومتوسط طبقہ کی تہذیبی وثقافتی قدروں کو پیش کرتا ہے۔ ناول ''چاندنی بیگم'' ہندوستان کے قدیم اعلیٰ طبقہ کے شرفاء اور ان کی بکھرتی ہوئی شان وشوکت کے ساتھ نئی تہذیب، نئے رجحانات اور طوائف الملوکی کی حسرت ناک کہانی کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ناول نگار نے اپنے ہر ناول میں اس رنگ بدلتی دنیا کا کسی نہ کسی پہلو سے تجزیہ کیا ہے۔

جہاں تک قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں کردار نگاری کا تعلق ہے تو ان کی کردار نگاری کسی ایک پہلو کی صرف نشاندہی نہیں کرتی بلکہ ان کے کرداروں میں زندگی کے تجربات کی وسعت اور مشاہدات کی گہرائی اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کی کردار نگاری درحقیقت ان کی تخلیقی ذہانت، فنکارانہ بصیرت اور قوت متخیلہ کی بے مثال مظہر ہے۔ ان کے یہاں مرد کرداروں کے ساتھ ساتھ نسوانی کردار بھی بہت اہمیت کے حامل اور باوقار ہیں۔ ان کے ناولوں کے نسوانی کردار عموماً اعلیٰ اور متوسط اور جاگیردارانہ طبقہ سے تعلق رکھنے والی نئی نسل کی پروردہ عورتیں ہیں جو تعلیم یافتہ اور مذہب پرست ہونے کے ساتھ ضدی اور ارادے کی پختہ بھی ہیں۔ ان کے اندر رومانیت اور جذباتیت بھی موجود ہوتی ہے۔ یہ ایسے نسوانی کردار ہیں جو اپنی خود ساختہ دنیا بنانے کی قابلیت واہلیت رکھتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے ان نسوانی کرداروں کو تجربات ومشاہدات کی ایک وسیع وعریض دنیا میں پیش کیا ہے۔ ''میرے بھی صنم خانے'' کی ہیروئن رخشندہ، ''سفینۂ غم دل'' کی عالیہ وعطیہ، ''آگ کا دریا'' کی چمپا اور نرملا، ''آخر شب کے ہمسفر'' کی دیپالی سرکار اور اومارائے، ''گردش رنگ چمن'' کی عندلیب وعنبرین بیگ اور ''چاندنی بیگم'' کی بیلا وچاندنی بیگم جیسے متحرک کرداروں کا قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں ایک سلسلہ ہے۔ ان کے اندر نسائیت کا رجحان دبا ہوا اور بلاضرورت نہیں ہے بلکہ یہ کردار بڑے سخت جان اور اصول کے پابند ہیں۔ یہ حالات کی کروٹوں سے گھبرا کر سپر نہیں ڈالتے بلکہ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے اور شکست وریخت کی صورت میں حسرت وناکامی لیے اپنے انجام کو پہنچتے ہیں۔ یہ نسوانی کردار اپنی سوچ اور نظریہ فکر کے لحاظ سے قدیم مشرقی تہذیب وثقافت اور جدید مغربی افکار ونظریات کا حسین آمیزہ نظر آتے ہیں، جو ہندوستان کے ترقی پذیر دور کی نئی روشنی اور ماڈرن مغربی تہذیب سے آراستہ جہاں دیدہ کردار ہیں۔ ناول

کے نسوانی کرداروں پر نگاہ ڈالیں تو ''میرے بھی صنم خانے'' کی رخشندہ، گئی کول، شہلا رحمن، سلطنت آراء، کرسٹابل، ''سفینۂ غم دل'' کی شگفتلا، عالیہ، میرا، عطیہ پروین ''آگ کا دریا'' کی چمپا، طلعت تہمینہ، نرملا، ''آخر شب کے ہمسفر'' کی دیپالی سرکار، ناصرہ نجم السحر، روزی بنرجی، فریدہ، اختر آراء، یاسمین ''گردش رنگ چمن'' کی عندلیب بیگ، عنبرین بیگ، نواب بیگم، مہرو، جن بی اور ''چاندنی بیگم'' کی بیلا، چاندنی بیگم اور صفیہ ایسے کردار ہیں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور جاگیردارانہ اور اشرافیہ طبقہ سے تعلق رکھنے والی عورتیں ہیں اور ان کرداروں میں سے ہر کردار معاشرتی تبدیلی کی بنا پر تغیر پسندی کی خواہاں ہے اور اپنے نظریات کے ذریعہ معاشرے کی تہذیب و ثقافت اور اقدار کو تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ مگر ان سب کے خواب ریزہ ریزہ ہو کر ٹوٹتے اور بکھرتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں حسرت و ناکامی ان کا مقدر بنتی ہے ان کے خواب کے بکھراؤ کے ساتھ ان کا ذہنی و فکری توازن بھی متزلزل ہوتا ہے اور ان پر جنون و دیوانگی طاری ہو جاتی ہے۔ اس طرح یہ نسوانی کردار حسرت و ناکامی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ناول کے کینوس سے غائب ہو جاتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے ناولوں کا عمیق النظری سے مطالعہ و مشاہدہ کیا جائے تو ہمیں ان کے ناولوں کے نسوانی کرداروں میں دو قسم کے کردار نظر آتے ہیں۔ پہلی قسم میں وہ نسوانی کردار آتے ہیں جو چمپا، نرملا، رخشندہ اور چاندنی بیگم کی طرح بالکل تخیلاتی نظریہ فکر رکھنے والی مثالیت پسند خواتین ہیں جو گردش زمانہ اور مردوں کی بے مروتی کے بھنور میں پھنس کر زندگی کے میدان میں ناکام و نامراد ہوتی ہیں اور ناکامی ان کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ بہر حال ناول نگار کے اس زمرے کے نسوانی کردار بہت ہی معصوم، پر سکون اور حجاب آمیز ہیں جن کا دل ہمیشہ اپنی نفسیاتی خواہشات اور امنگوں سے بھرپور ہونے کے باوجود بھی ذہنی خلفشار اور کشمکش کا شکار رہتا ہے اور وہ زندگی کے میدان میں اپنی مرضی کے مطابق کسی قسم کا اقدام کرنا پسند نہیں کرتی ہیں اور اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ دیتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ناول کے اس طرح کے نسوانی کرداروں میں حوصلہ مندی اور ہمت کی کمی پائی جاتی ہے اور یہ کہ وہ ضرورت سے زیادہ فلسفیانہ مزاج رکھتی ہیں جیسا کہ نسوانی کرداروں کے دوسرے زمرے میں باغی اور انقلابی عورتیں ہیں جو اپنی ایک الگ اور منفرد شناخت رکھتی ہیں اور ناول کے پورے کینوس پر چھائی رہتی ہیں۔ ایسے نسوانی کرداروں میں کرسٹابل، گئی کول، میرا، عطیہ، عالیہ، دیپالی سرکار، اومارائے، ناصرہ نجم السحر، روزی بنرجی، چمپا، عندلیب، عنبرین، نواب بیگم، بیلا اور صفیہ۔ ناول کے اس زمرے کے نسوانی کرداروں میں یہ ایسی عورتیں ہیں جو اپنے اندر بہت سے معاشرتی راز پنہاں کیے ہوئے ہیں۔ یہ عورت ہونے کے باوجود بھی مردوں سے بڑھ کر تحریکی سرگرمیوں میں شریک ہوتی ہیں اور ان کی زندگی میں الفت و محبت کی ایک دلفریب کہانی بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہ ایسے نسوانی کردار ہیں جو اپنے مقصد کے حصول اور اپنی امنگوں اور آرزوؤں کی تکمیل کی غرض سے اقدام و عمل بھی کرتی ہیں۔ خواہ ان کا یہ قدم اپنی ذات کی تسکین کی خاطر ہو یا اجتماعی مفادات کے حق میں ہو وہ حرکت و عمل کرنے سے گریز نہیں کرتی ہیں۔ ان نسوانی کرداروں کی زندگی بڑی پر خطر اور پر اسرار راہوں سے ہو کر گزرتی ہے، جس پر چلتے ہوئے وہ زبردست قائدانہ صلاحیت، عزم مصمم اور ایثار و قربانی کا ثبوت دیتی ہیں۔ ان کے دل و دماغ اپنے افکار و خیالات اور نظریہ فکر کی ایک ایسی تپش سے مضطرب رہتے ہیں جو انھیں عمر بھر گرم متحرک اور فعال رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ اپنی ذاتی دنیا بسانے کی غرض سے کبھی حوادث دہر سے مصالحت کر لیتی ہیں تو کبھی زمانے کی گردش کے ساتھ حسرت و ناکامی لیے ہوئے ایک المناک انجام کے ساتھ ناول کے کینوس سے رخصت ہوتی ہیں۔ پروفیسر وحید اختر لکھتے ہیں:

> ''یہ بات غیر اہم نہیں ہے کہ ان کے بیشتر افسانوں میں مرکزی کردار عورت ہی کا ہے۔ مردوں کا کردار عموماً ذیلی اور معاون قسم کا ہے''

(اردو افسانہ۔ روایت اور مسائل، مرتبہ: گوپی چند نارنگ، ص: 460)

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں دونوں طرح کے نسوانی کردار مرد کرداروں پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان نسوانی کرداروں کا المیہ یہ ہے کہ یہ اپنے پسندیدہ مرد کرداروں کی شریک حیات نہیں بن پاتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے ناولوں کے نسوانی کردار اپنی تمام دلفریبی و بشاشت کے باوجود بھی فراق زدہ ہیں۔ یہ حیات کے سمندر میں طوفانوں سے برسرپیکار تو رہتی ہیں مگر انھیں ساحل نصیب نہیں ہوتا۔

ان کے ناولوں میں نسوانی کردار تعلیم یافتہ، روشن خیال، نئے تہذیبی خیالات کی پروردہ و باوقار خواتین ہیں۔ ان کے ناولوں کے بیشتر کرداروں کا تعلق اعلیٰ متوسط طبقہ سے ہوتا ہے جہاں عیش و آرام میسر ہوتا ہے اور جو معاشی اور سماجی مسائل سے دور ہوتے ہیں مگر وہ اپنے سماج سے راہ فرار اختیار نہیں کر پاتے اور وہ اپنی ذہنی الجھنوں اور پریشانیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ممتاز شیریں قرۃ العین حیدر کے متعلق لکھتی ہیں:

> ''قرۃ العین حیدر کے ناولوں اور افسانوں میں صرف جذبات اور احساسات کی عکاسی ہوتی ہے، جسم کا کہیں بھی احساس

نہیں ہوتا۔ نازک سے نازک موقعوں پر بھی وہ اس سے بچ نکلتی ہیں۔ تنہائی میسر آتی ہے۔ ایسے موقعوں پر بھی عریانی تو ایک طرف جسم کے لمس کا ہلکا سا احساس بھی نہیں ہوتا"

(ایک منفرد افسانہ نگار۔ ممتاز شیریں، ص:75)

قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں نسوانی کردار اکثر و بیشتر جاگیردار گھرانہ اور طبقۂ اشرافیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ کردار جدید تعلیم و تربیت سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ تہذیب و ثقافت کی نمائندہ بھی ہیں اور ضد و سرکشی کے پتلے بھی ہیں۔ یہ نسوانی کردار اس قدر قوت ارادی کے مالک ہیں کہ اپنی دنیا خود بنانا چاہتے ہیں اور اپنے خود ساختہ اصول و قوانین کی پاسداری کرتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ اپنی خود ساختہ دنیا ریت کا گھروندا ثابت ہوتی ہے جو پل بھر میں ختم ہوجاتی ہے اور ان کی ساری آرزوئیں اور امنگیں بکھر جاتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں نسوانی کرداروں کی معاشرت سے متعلق گفتگو کی جائے تو ان کے ناول "میرے بھی صنم خانے" کی رخشندہ اپنے عصر کے تہذیبی و معاشرتی رجحانات کو پیش کرنے والا بہترین کردار ہے۔ رخشندہ اس ناول کی ہیروئن بھی ہے اور اس کے گرد پورا ناول گردش بھی کرتا ہے۔ یہ جدید تعلیمی فکری نظریات سے مملو سماجی و معاشرتی لحاظ سے ایک باوقار، ذہین اور قلب و نظر پر بہت گہرے اثرات چھوڑنے والا کردار ہے۔ اس کردار کے اندر اگر ایک طرف عورت کی نفسیات، دوستی کا احساس، فرماں بردار بیٹی اور خاندان کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ذمہ داری کا احساس ہے تو دوسری طرف حالات اور حادثات سے ٹکرانے کی پوری صلاحیت اس کے اندر موجود ہے۔ خود اعتمادی اور بھروسہ مندی کی جو بہترین مثال قرۃ العین حیدر نے چمپا کے روپ میں پیش کی ہے وہ اُردو کے کسی بھی ناول میں نہیں ملتی۔

'گردش رنگ چمن' کے نسوانی کرداروں کے مقابلے میں چاندنی بیگم کی بیلا ایک نہایت ہی چالاک اور تیز ذہنیت رکھنے والا فریبی کردار ہے۔ یہ کردار نہ صرف اپنی جعل سازی سے قمبر علی سے شادی کر لیتا ہے بلکہ ان کی تمام دولت پر قابض بھی ہوجاتا ہے۔ بیلا پست خاندان سے تعلق رکھنے والی پیشہ ور مغنیہ ہے جو گھر گھر گانا گا کر اپنی زندگی کے ابتدائی ایام گزارتی ہیں مگر اپنی چالبازیوں اور حسین اداؤں سے جاگیر دار قمبر علی کو اپنے عشق کے جال میں گرفتار کر لیتی ہے اور دھوکہ دے کر ان کو شادی کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ شادی کے بعد وہ قمبر علی کی جائداد اور دولت کو مختلف بہانوں سے اپنے قبضہ میں کرنا چاہتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کا طرز زندگی بھی تبدیل ہوجاتا ہے۔ وہ فیشن کی بڑی دلدادہ ہے۔ نئے طرز کے فیشن کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ بیلا کے سامنے قمبر علی کا سارا رکھ رکھاؤ اور شان و شوکت ماند پڑ جاتی ہے۔ وہ اس کے سامنے خود کو مجبور پاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ناول میں 'چاندنی بیگم' کا کردار ایک مشرقی تہذیب و ثقافت کی پروردہ عورت کے روپ میں ابھرتا ہے۔ 'چاندنی بیگم' کا کردار ایک آئیڈیل کردار ہے، یہ ایک ایسی عورت کا کردار ہے جو ساری زندگی محنت و مشقت اور صبر و قناعت کے ساتھ حالات کی سختی کا مقابلہ کرتی ہے اور ریڈ روز کے منہدم ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا کردار بھی ختم ہوجاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں:

"تمھارا وجود ماضی کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ تمھاری زندگی کا سوائے اب تمھارے کسی کو فائدہ نہیں۔ تم اپنے زمانے کے نمائندے ہو اور تمھاری اپنی کوئی چیز باقی نہ رہ جائے گی، تم کس طرح سوچتے تھے کیسے زندہ تھے۔ سب زندگیاں برابر ایک سی ہیں۔ مستقبل کو اب کسی کا انتظار نہیں"

(سفینۂ غم دل، قرۃ العین حیدر، ص:361)

قرۃ العین حیدر کے ناولوں کا مواد برطانوی نو آبادیاتی (Colonial) عہد اور اس کے ہندوستانی معاشرے کی قدروں سے اخذ کیا جاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ناول اس عہد اور معاشرے کی تہذیبی و ثقافتی حالت کی دلچسپ اور رنگا رنگ تصاویر پیش کرتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے ناولوں کو اس وجہ سے بھی انفرادیت و برتری حاصل ہے کہ انھوں نے کولونیل ہندوستان کے ماضی اور حال کو پوری انسانی تاریخ کے تجربے کے ایک جز کے طور پر پیش کیا ہے اور مستقبل کے امکانات و خطرات سے آگاہ کیا ہے وہ ایک ہی وقت میں عہد ماضی اور زمانہ حال دونوں میں سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ قرۃ العین کے یہاں انسانی وجود کی داخلی کشمکش، ذہنی خلفشار اور احساس تنہائی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان کی اکثر و بیشتر تخلیقات ورجینیا وولف کے اس نظریہ فکر کی کارفرمائی کرتی ہیں کہ زندگی شعور کے آغاز سے انجام تک محیط روشنی کا ایک ہالہ ہے اور ناول نگار کا کام یہ ہے کہ وہ اس نازک خواب اور اجنبی و پراسرار کیفیتوں کو سچائی کے ساتھ اپنی تخلیقات میں پیش کر دے ان کی تخلیقات کی ایک اہم خصوصیت ان کا خوبصورت رواں شائستہ نثری اسلوب ہے۔ جس میں چستی ہی نہیں تہہ داری اور تنوع بھی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے ناولوں کے ذریعہ ایک ایسی مشترکہ تہذیب کو پیش کیا ہے اور ایسے تہہ دار اور بلیغ کرداروں کے ذریعہ سے ہندوستانی شخصیت کو اجاگر کیا ہے، جن کا خمیر کئی قوموں اور نسلوں کے تہذیبی اختلاط کا رہین منت

رہا ہے۔قرۃ العین حیدر ہندوستانی تہذیب وثقافت اوراس کے افکار واقدار کوایک نامیاتی وحدت کے روپ میں دیکھتی ہیں اوراپنے ناولوں میں اس کو بڑی ہنرمندی وچابکدستی سے پیش کرتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر ایک ایسی ماہر تخلیق کار ہیں جن کے ناولوں میں رومانی تخیل، نفسیاتی تصور، فلسفیانہ خیالات کے ساتھ ساتھ مشاہدے کا اخلاص فن کے نت نئے تجربات کا ایک ایسا حسین امتزاج ملتا ہے جوقاری کو ناول نگار کے فنی ہیت اور تکنیک کے جدید نظریات سے ہمکنار کرتا ہے۔ چنانچہ قرۃ العین حیدر کا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' لکھنؤ کے معاشرتی آداب کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔ لکھنؤ کی گنگا جمنی تہذیب، زوال اودھ، زمانہ کی تبدیلی، بدلتی قدریں، نئی تعلیم وتربیت، جدید نظریہ فکراور ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کے دلفریب اور سحر انگیز مضامین نئی روشنی اور اس سے نوجوان لڑکے لڑکیوں کے دلوں میں پیدا ہونے والے وسوسے اور انگڑائیوں کی یہ ناول بہترین عکاسی کرتا ہے۔ یہ ناول تقسیم ہند کی المناک داستان کوافراد کی باطنی خلش اور ماضی وحال کے انتہائی تعلق کی علامت کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ ناول ''سفینۂ غم دل'' کا موضوع بھی تقسیم ہند اور اس کے نتیجہ میں رونما ہونے والا فساد ہے اور تقسیم ہند کے بعد فسادات سے نجات حاصل کرنے کی لوگوں کی جدوجہد کواس ناول کا موضوع بنایا گیا ہے۔

اس ناول کے کردار بھی اعلیٰ اور متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور تعلیم یافتہ اور جدید تہذیب کے پروردہ افراد ہیں۔ ناول 'آگ کا دریا' بھی تقسیم ہند اوراس کے بعد ہندوستان میں پرورش پارہی نئی صورت حال، تقسیم کے نتیجے کوباقی رکھنے کے لیے جدوجہد، ماضی پرستی اور نوحہ عصر جیسے بہت سے اہم نکات کے گرد یہ ناول گردش کرتا ہے۔ جب کہ ناول 'آخر شب کے ہم سفر' کا موضوع 'میرے بھی صنم خانے'، 'سفینۂ غم دل' اور 'آگ کا دریا' سے بہت مختلف ہے اوراپنے موضوع اور اسلوب نگارش کی بنا پر ان تینوں سے الگ اپنی ایک منفرد شناخت رکھتا ہے۔ اس ناول میں بھی قرۃ العین حیدر کے دیگر ناولوں کی طرح وقت ایک محرک ہے جواپنے بیشتر کرداروں کوان کے خوابوں، آرزوؤں اور خواہشات کوایک شکستہ خواب میں تبدیل کردیتا ہے۔ ناول '' کار جہاں دراز ہے'' ایک سوانحی ناول ہے اس کا کینوس ہندوستان کی ڈیڑھ ہزار سالہ پرانی تہذیب سے شروع ہو کر موجودہ ہندوستان کی جدید تہذب تک محیط ہے۔ یہ سوانحی ناول ہندوستان کی تاریخ، تہذیب، ادب اور سیاست کا حسین واقعاتی مرقع نظر آتا ہے۔ جبکہ 'گردش رنگ چمن' کا موضوع بہت مختصر ہونے کے باوجود بھی بہت پہلودار اور متنوع ہے، اس ناول کا موضوع معاشرے کی بدلتی ہوئی صورت حال،

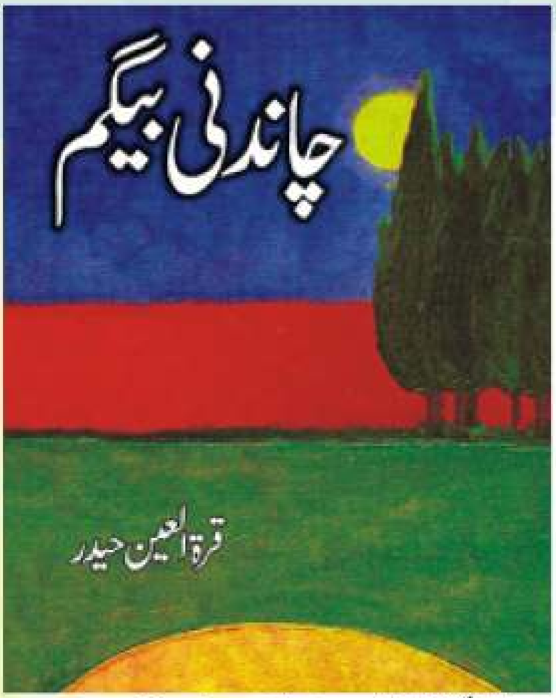

جدید نظریہ فکر کی آمیزش، نئے مغربی تہذیب وثقافت کی پاسداری، مذہبی اور تہذیبی اقدار میں ترسیلی خلاء، عرفان نفسی اور عرفان ذات کی کمی اور Identity Crisis کی کمی جیسے اہم موضوعات کوناول کا تانا بانا بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قرۃ العین حیدر کا آخری ناول ''چاندنی بیگم'' بیسویں صدی کے ہندوستانی طبقۂ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے مسلم گھرانے کی المناک اوردردانگیز بربادیوں کی داستان ہے۔

ان کے یہاں عورت بہت نڈر اور بے باک نظر آتی ہے، وہ اپنے حالات سے متصادم بھی اوراس پر قابو بھی رکھتی ہے۔ وہ سماج میں اپنی ایک انفرادیت بھی پیدا کرتی ہے۔ وہ کہیں نازکی اور شرم وحیا کا پتلا ہے تو کہیں مغرب پرست اور زمانے کے نئے رکھ رکھاؤ میں رچی بسی ایک فیشن ایبل لڑکی کی شکل میں نظر آتی ہے۔ ان کے ناول میں نسوانی کردار اس قدر قد آور اور متحرک ہیں کہ وہ اپنی زندگی کے پورے سماجی طرز کو تبدیل کرنے کے لیے سرگرم عمل ہیں۔

□□□

Dr. Haris Hamzah Lone
R/O: Rehmatabad Rafiabad
Post Office Chatloora, Tehsil:watergam
District: Baramulla-193301(J&K)

عالیہ

خواتین افسانہ نگاروں میں تانیثی رجحان 1980 کے بعد

ہر تخلیق اپنے عہد و معاشرے کی عکاس ہوتی ہے۔افسانہ بھی ایک ایسی صنف ہے جو سماج کی زندہ حقیقتوں کا مظہر ہے۔افسانے میں تانیثیت کے رجحان سے یہ مراد ہے کہ اس میں عورتوں کے سماجی ، معاشی، جنسی و نجی مسائل اور ان کے حل بیان کیے جائیں۔ اگر غور کیا جائے روایتی افسانوں میں تو عورت ہمیشہ ظلم و تشدد کا شکار رہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ظلم و تشدد کی شکلیں بدلتی رہی ہیں۔ دراصل ہندوستانی معاشرے میں عورت کی تاریخ کربناک رہی ہے ۔ یہ وہی معاشرہ ہے جہاں عورت کو ستی کی رسم کے نام پر زندہ جلانے یا اس کے پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ کر مار دینے کے وحشیانہ عمل سے گزارا جاتا تھا۔ یا بال وواہ جیسی رسم راجہ رام موہن رائے اور اینی بیسنٹ جیسے بڑے مصلح معاشرہ کے ذریعہ ان قدیم رسموں کو توڑا گیا۔

اس کے بعد بھی عورت پہلے بیٹی بن کر باپ اور بھائی کے ذریعہ پردے کی یا باہر آنے جانے کی پابندی سے ذہنی استحصال میں مبتلا رہتی ہے اور شادی کے بعد شوہر اس کے وجود پر حاکم کی طرح مسلط ہو کر اسے ذہنی و جنسی استحصال کا شکار بناتا ہے۔

بقول بالزاک:

”عورت کو نام تو ملکہ دیا جاتا ہے لیکن برتاؤ غلام کا سا ہوتا ہے۔“

دراصل عورت کا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ عورت کو مردوں سے کمتر سمجھا گیا ہے۔لاطینی زبان کا ایک قدیم مقولہ ہے۔” "Total Mulier in utero' "جس کا انگریزی میں ترجمہ ہوا۔ "Women is nothing but a womb" یعنی اسے محض آلۂ تولید سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اردو افسانے کی تاریخ میں ترقی پسند تحریک کا دور سنہرا دور کہلاتا ہے۔ جس میں رشید جہاں، بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور منٹو وغیرہ نے شاہکار افسانے لکھے۔ لیکن عورت کی بدقسمتی یہ رہی کہ وہ ترقی پسند دور میں بھی بوسیدہ و فرسودہ روایتوں میں جکڑی رہی۔ اس دور میں بھی اس کی اہمیت سے انکار کیا گیا۔

بیدی کی کہانی 'لاجونتی' میں یا تو اس کے ساتھ جانوروں کا سلوک کیا جاتا تھا یا اسے دیوی کا درجہ دے دیا۔عورتوں کا اپنے حق کے لیے لڑنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ انہیں دیوی بنا دیا جائے یا انہیں مردوں سے برتر سمجھا جائے اگر انہیں مردوں سے برتری دی جائے گی تو اس میں بھی کوئی حل نہیں نکلے گا بلکہ معاشرہ من و عن ویسا ہی رہے گا جیسے پہلے تھا۔ بس فرق صرف اتنا ہوگا کہ مرد کا مقام عورت کو حاصل ہو جائے گا اور مرد عورت کے مقام پر آجائے گا۔

1980 کے بعد کی دہائیوں میں اردو افسانے میں تانیثی رجحان شدت سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ بالخصوص خواتین افسانہ نگاروں کے یہاں تحریک نسواں کے افکار و عوامل نظر آتے ہیں۔ 1980 کے بعد کی خواتین افسانہ نگاروں میں قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، واجدہ تبسم، ذکیہ مشہدی، بانو سرتاج، قمر جہاں، صبیحہ انور، ترنم ریاض، غزال ضیغم، صادقہ نواب سحر، وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ میں یہاں چند افسانہ نگاروں پر ہی اکتفا کروں گی۔

جدید دور کے افسانوں میں عورت کے کردار میں بڑی تبدیلی

محسوس کی گئی۔ چونکہ جدید زمانہ عورت کو گھر کی چار دیواری سے باہر دفتروں، کلبوں، جلسوں اور کارزار حیات کے دیگر شعبوں میں لے آیا ہے۔ جس کی وجہ سے عورت کے کردار میں وسعت پیدا ہوئی اس کے ساتھ عورتوں میں تعلیم عام ہوئی۔ حصول تعلیم کے بعد ان کے خام عزائم و حوصلوں میں پختگی پیدا ہوئی۔ خاندان اور معاشرہ کی پابندیاں کم ہوگئیں اسے اپنی زندگی پر جزوی اختیار حاصل ہوا۔ اپنی زندگی سے متعلق اچھے برے فیصلے کرنے کا اعتماد پیدا ہوا۔ اس صورتِ حال کے نتیجے میں اردو افسانے میں بھی عورت کا ایک نیا روپ ابھر کر سامنے آیا۔

غیر متحرک اور مظلوم عورت کی جگہ سماج کی جیتی جاگتی عورت نے لے لی۔ خواتین افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں ایک متحرک و فعال عورت کی صورت گری کی ہے۔ آج کی عورت ظلم وجبر کے خلاف اور اپنے حقوق کے لیے صدائے احتجاج بلند کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

80 کے بعد کی خواتین افسانہ نگاروں میں قرۃ العین حیدر ایک اہم اور بڑا نام ہے۔ قرۃ العین حیدر کے نسوانی کردار عموماً وہ بدنصیب عورتیں ہیں جو مرد کے استحصال کا شکار ہوتی ہیں وہ وفا شعاری اور خودسپردگی کے باوجود بے وفائی کی شکار ہوتی ہیں۔ مایوسی ان کا مقدر ہے۔ مظلوم عورت کی یہ داستان کسی نہ کسی طرح عینی کی ہر تخلیق میں موجود ہے۔ عورت کی بدنصیبی کو وہ کبھی اپنے مضامین وانٹرویو میں بیان کرتی ہیں کبھی اپنے کرداروں کی زبان سے ان کا دکھڑا روتی ہیں۔ ''یادوں کی دھنک جلے'' میں نہ صرف وہ یہ سوال اٹھاتی ہیں کہ عورت ہی اتنی پرستش اور پوجا کیوں کرتی ہے بلکہ تفصیل بھی بیان کرتی ہیں۔

''ازل سے عورت ہی وہ مخلوق ہے جس کی قسمت میں ساری بدنصیبیاں لکھی ہوئی ہیں۔ یہ عورت ہی ہے جو ساری عمر مردوں کی مختلف قسموں سے محبت کرنے کے باوجود ٹھکرادی جاتی ہے۔ کبھی مرد اسے شوہر کے روپ میں ٹھکرادیتا ہے، کبھی بیٹا ماں کے روپ میں، محبوبہ محبوب کے روپ میں لیکن عورت اس کے باوجود ان تمام مختلف رویوں سے بے انتہا پیار کرتی ہے۔ یہ عورت ہی ہے جو اپنی بے چارگی، اپنی مجبوریوں اور مایوسیوں کا رونا رونے کے لیے گرجا گھروں، مندروں، تیرتھ استھانوں درگاہوں اور مزاروں پر جاتی ہے۔ اور اپنی بے بسی کا شکوہ کرتی ہے۔''

(یادوں کی دھنک جلے۔ ص136)

اس طرح ان کی کہانی 'کارمن' میں لڑکی اپنے بے وفا دوست 'نک' کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ یا ان کے افسانے 'حسب نسب' میں 'چھمی بیگم' اپنے ہونے والے شوہر 'لقو' کے انتظار میں عمر کے ۴۰ سال گزار دیتی ہے۔

اس طرح کے حالات نے عورتوں میں مرد بیزاری کا احساس پیدا کیا۔ عورت کو حقارت کی نظر سے دیکھنے اور اسے مردوں سے کمتر سمجھنے کے خیال نے اسے مرد اساس معاشرے سے نفرت کی طرف مائل کیا۔

جس کی بنیادی وجہ سماج میں قائم Patriarchy System یعنی پدرشاہی نظام ہے جو مذہب کی دین ہے کیونکہ مذہب عورتوں کے مساوی حقوق کو قبول نہیں کرتا Catholic Church میں عورت Pope نہیں بن سکتی، مندر میں مہنت یا مٹھادھیش نہیں بن سکتی اور مسجد میں امام نہیں بن سکتی حالانکہ ہندو مذہب میں بہت سی Goddess موجود ہیں لیکن پھر بھی ہم پر پدرسری نظام غالب ہے۔

ترنم ریاض نے اپنے افسانے 'ناخدا' میں پدرشاہی نظام کے خلاف قلم اٹھایا ہے۔ جس میں پہلے بیٹی بن کر اور بعد میں بیوی بن کر باپ اور شوہر کے ہر حکم کی تعمیل کرنا عورت کا فرض سمجھا گیا ہے۔ افسانے کے دوسرے حصے میں عورت اپنے شوہر کو اپنے وجود کا احساس دلانے کا منصوبہ اس طرح بناتی ہے کہ:

''سب سے پہلے انہیں یہ احساس دلایا جائے کہ میں اس قدر ان کے رحم وکرم پر نہیں ہوں جتنا کہ وہ سمجھتے ہیں اور نہ ہی وہ خود اتنے اہم ہیں جتنا کہ وہ ظاہر کرنے کے درپہ رہتے ہیں بلکہ میں بھی ان کے اور گھر کے لیے اتنی اہم ہوں جتنا کہ وہ خود۔''

ترنم ریاض اس افسانے کے ذریعہ عورتوں کو یہ پیغام بھی دیتی ہیں کہ اگر ظلم وستم کے خلاف آواز بلند نہیں کی تو مستقل عورتوں کو اسی طرح دبایا اور کچلا جاتا رہے گا۔

ترنم نے اپنے افسانے ''کانچ کے پردے'' میں عورت کو ایک ایسے مزدور سے تعبیر کیا ہے جو بغیر کسی معاوضے اور بغیر کسی چھٹی کے گھر کی چار دیواری میں قید ہو کر ملازمہ کی زندگی گذار رہی ہے۔

تحریک نسواں میں عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ پہلا اور بنیادی مسئلہ ہے اردو میں سب سے پہلے حالی نے عورتوں کے تعلیم کے حق میں آواز بلند کی جبکہ سرسید کی نظر میں عورتوں کے لئے بہشتی زیور اور قرآن وحدیث کی بنیادی تعلیم ہی کافی تھی۔ حالانکہ اس نظریے کو سب سے پہلے ۱۷۹۲ء

میں Mary wallstone Crafts نے اپنی کتاب A vindication of the Rights of women میں پیش کیا ہے۔

عورتوں کے حقوق تعلیم آج بھی موضوع گفتگو ہیں۔ غزال ضیغم کے افسانے ''سوریہ ونشی چندر ونشی'' میں عورتوں کی تعلیم حاصل کرنے کے حق اور آزادی و خود مختاری کے حق کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس افسانے میں ''روحی'' جو قانون کی تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے لیکن گھر والے یہ کہہ کر اس کی تعلیم سے انکار کردیتے ہیں کہ لڑکیوں کے لئے تعلیم قانون مناسب نہیں ہے لیکن روحی روایتی دور کی وہ لڑکی نہیں ہے جو سر جھکائے آنکھوں میں آنسو بھر کر والدین یا چچا کی خوشی کی خاطر اپنے اعلی تعلیم کے خوابوں کو شکست خواب کی شکل دے دے بلکہ وہ اکیسویں صدی کی لڑکی ہے جو بے محابہ اپنے حق کے لیے والد اور چچا سے برابر کی بحث میں شریک ہوتی ہے اور اپنے حق کی بات منوا کر قانون کی تعلیم حاصل کرنے شہر جاتی ہے۔ کالج کی مختلف سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے اس کے علاوہ روحی کی شادی اس کی مرضی کے بغیر خاموشی سے طے کرنا بھی روحی کے باغی جذبہ کو تقویت دیتا ہے۔ اس طرح روحی کا کردار اکیسویں صدی کی خود مختار، بے باک، پر اعتماد اور نئی غزل پر سفر کرنے والی لڑکیوں کی کہانی کو بیاں کرتا ہے۔

غزال ضیغم کا افسانہ 'نیک پروین' میں بھی تحریک نسواں کا اثر غالب ہے اس میں ازدواجی زندگی کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں شوہر ایک رفیق اور شریک حیات کا کردار ادا نہیں کرتا بلکہ بیوی کو ایک خادمہ سمجھ کر سلوک کرتا اس قسم کے رویے سے کنیز کے دل میں مرد سے نفرت کا اظہار ہوتا ہے۔ اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ مرد کی ذات ہی (معذرت کے ساتھ) کتے جیسی ہوتی ہے۔ کنیز شوہر کی اقسام پر اس طرح تبصرہ کرتی ہے۔

''عورتیں بتائیں کہ شوہر بھی طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ بس برانڈ الگ ہوتے ہیں۔ بل ڈاگ (Bull Dog)، جرمن شیفرڈ (German Shephard)، السیشن (Alsation)، پاکٹ ڈاگ (Pocket Dog)، گرے ہاؤنڈ (Grey Haund)، پامیرین (Pomerain)، فاکس ٹیریر (Fox Terrior)، ڈابرمین (Doberman)، لیبراڈور (Labrador)، دیسی...... ان کو سختی سے باندھ کر رکھو نہیں تو موقع ملتے ہی یہ ادھر ادھر منہ مارنے لگتے ہیں''

خواتین کے جنسی استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا بھی تحریک نسواں کا اہم حصہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ جدید دور کی اہم افسانہ نگار واجدہ تبسم نے لڑکیوں پر ہونے والے جنسی استحصال پر چوٹ کی ہے۔ ان کے افسانے 'لڑکی بازار' میں حبیب یار جنگ حیدرآباد کا عیاش کم سن دوشیزاؤں کا بازار سجاتا ان میں کسی ایک سے شادی کرتا اور ایک سال میں طلاق کے کاغذ اس کے ہاتھ میں تھما دینا، یہی اس کی زندگی کا معمول بن گیا تھا۔ اک کمسن دوشیزہ مہتاب اس کی تعیش بھری زندگی کو نیست و نابود کرنے کا منصوبہ بناتی اور اس کے بازار میں نہ جانے کی ضد کرتی ہے۔ اس طرح مہتاب کا کردار اس استحصال کو ختم کرنے کی مکمل سعی کرتا دکھائی دیتا ہے۔

اس کے علاوہ واجدہ تبسم نے متعدد شادی اور طلاق کے غلط استعمال کے برے نتائج کی نشاندہی کی ہے۔ واجدہ تبسم کے دیگر افسانوں ''زخم تمنا'' اور ایک 'چنبیلی کے منڈوے تلے' میں بھی نسائی احساسات کی آہٹ محسوس کی جاسکتی ہے اس طرح کی مزید مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ دور میں بھی عورت کو متعدد سماجی، معاشی و ثقافتی مسائل درپیش ہیں۔ آج بھی وہ جسمانی و نفسیاتی استحصال کا شکار ہے۔

آخر میں بس اتنا ہی کہ تانیثی رجحان کا ارتفاع طلوع انسانیت کی ابتدا ہو جائے تاکہ مرد و زن دونوں کو یکساں احترام حاصل ہو۔ المیہ یہ ہے کہ آج بھی ہمارا معاشرہ انسان کا مطلب مرد تصور کرتا ہے اگر عورت کو بھی انسان سمجھ لیا جائے تو تفریق کی بنیاد ہی ختم ہو جائے۔

نیویارک کی فیمنسٹ ناؤمی وولف نے اپنی کتاب Fire with Fire میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ عورت کو اپنے عورت پن پر نہیں لڑنا چاہئے اپنے انسان ہونے کی لڑائی لڑنی چاہئے۔ عورت کا یہ کہنا میں ایک Feminist ہوں یہ کہنے کی طرح ہونا چاہئے کہ میں ایک انسان ہوں، چونکہ ہم پہلے انسان ہیں بعد میں مرد اور عورت۔ ناؤمی کا کہنا ہے کہ اس تحریک کا نام Feminism Movement کے بجائے Humanism Movement ہونا چاہیے۔

Aaliya
Research scholar
H.No. D-31. Lane No.1
Noor-e-Ilahi North Ghonda
Delhi-110053

سمیہ بانو

صغرا مہدی کے افسانوں کا فکری کینوس

اردو افسانے نے ابتدا سے اب تک رومانیت، حقیقت پسندی، ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسے کئی منازل طے کیے۔ صغرا مہدی باقاعدہ طور پر جس وقت فکشن نگاری کی دنیا میں داخل ہوئیں وہ جدیدیت کے عروج کا زمانہ تھا مگر انھوں نے خود کو کسی تحریک یا ازم سے نہیں جوڑا اور آزادانہ طور پر اپنی تخلیقی مسافت جاری رکھی۔ صغرا مہدی نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن فکشن ان کی دلچسپی کا خاص میدان تھا۔ انھوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز افسانے سے کیا۔ معروف فکشن نگار صالحہ عابد حسین کی صحبت اور حوصلہ افزائی کی بدولت ان کی تخلیقات کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ''عصمت''، ''بیسویں صدی''، ''سہیلی''، ''سب ساتھیہ'' جیسے مشہور رسالوں میں ان کے افسانے شائع بھی ہوئے۔ کچھ افسانے آل انڈیا ریڈیو اردو سروس اور نیشنل چینل سے براڈ کاسٹ بھی ہوئے۔

صغرا مہدی کی افسانوی کائنات چار مجموعوں پر مشتمل ہے۔
'پتھر کا شہزادہ'، 'جو میرے وہ راجہ کے نہیں'، 'پہچان' اور 'پیش گوئی'
مذکورہ بالا مجموعوں میں شامل افسانوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کی سماجی ضرورتوں کے تحت ایسے افسانے لکھے جس میں نئے عہد کے نئے مسائل کے ساتھ ساتھ مثبت اقدار و روایات کا بھی عکس نظر آتا ہے۔ ان کے تخلیقی رویے میں صالحہ عابد حسین کی اصلاح پسندی اور حقیقت نگاری کا رجحان غالب ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ہندوستانی تہذیب کی روح اور انسانی وجود کے اس حصے کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو کٹ کر ماضی سے الگ ہو گیا جس کے بغیر وہ انسانی وجود کو نامکمل تصور کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی موضوع پر قلم اٹھاتے وقت انھوں نے زندگی کے مثبت اقدار مثلاً اصول پرستی، بھائی چارگی، ایمانداری، رحم دلی، محبت، خلوص، دردمندی اور انسان دوستی جیسے جذبات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ان کی نظر میں ایک فرد نہیں بلکہ عہد حاضر کا پورا سماجی و معاشرتی نظام ہے جہاں بداعمالی، بدعنوانی اور بے اعتدالی کے نتیجے میں فسادات جیسے عوامل تشکیل پا رہے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں میں ایک طرف نئی نسل ہے جو اپنے کیریئر کو بنانے کے لیے ہر طرح کے جائز و ناجائز حربے استعمال کر کے جلد از جلد ترقی کی منزلوں تک پہنچنا چاہتی ہے۔ دوسری طرف پرانی نسل کے وہ اشخاص ہیں جو ایمانداری، دیانتداری اور اصول پرستی کی راہ پر چلتے ہوئے نئی نسل کی طرز زندگی اور نئی تہذیب کی رنگینیوں سے نالاں نظر آتے ہیں۔ صغرا مہدی نے قدیم نسل کے احساسات و جذبات کے ذریعے نہ صرف زندگی کا مثبت تصور پیش کیا بلکہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو نمایاں کر کے نئی نسل کی بے راہ روی، بزدلی اور کم ہمتی کو بھی بے نقاب کیا۔ افسانہ ''پیش

گوئی'' میں ایک اصول پرست اور فرض شناس انسان کو کردار بنا کر افسانہ نگار نے سماجی بدعنوانی اور رشوت خوری پر طنز کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ نئی نسل کی ذہنیت کی عکاسی کی ہے جو زیادہ سے زیادہ پیسہ دے کر جلد از جلد اپنا کام کرانا چاہتے ہیں۔ شادی بیاہ کے موقع پر شاندار دعوت کو اپنی شان سمجھتے ہیں جب کہ اپنے پڑوسی کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے۔ درج ذیل اقتباس سے دونوں نسل کی ذہنیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

''ابا جان کچھ دے دلا دیتے......''

''مگر کیوں؟ یہ ان کی ڈیوٹی ہے ان کو اس کی تنخواہ ملتی ہے۔ ہم ٹیلی فون کا کرایہ دیتے ہیں۔ یہ بات اصولاً غلط ہے''

''ابا آج کل زمانہ اور یہ اصول وصول کی بات نہ کوئی کرتا ہے نہ سنتا ہے، ہر کام کے لیے مٹھی گرم کرنا پڑتا ہے''

''جب تم یہ کہتے ہو کہ آج کل سب یہ کر رہے ہیں، تو میں حیران رہ جاتا ہوں۔ سب لوگوں کے کرنے سے غلط صحیح ہو جاتا ہے۔ بے اصولی اصول بن جاتی ہے''

(ص:13، پیش گوئی)

صغرا مہدی کے افسانوں میں جہاں ایک طرف قدیم نسل کے افکار وخیالات کے ذریعے مثبت فکر کو پیش کیا گیا ہے وہیں دوسری طرف جدید نسل کے فکر وعمل کے ذریعے ان کی بے راہ روی، کم ہمتی اور بزدلی کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے۔ نئی اور پرانی نسل میں تصادم کی کیفیت ان کے افسانہ ''وہ بوڑھا''، ''پیش گوئی''، ''زخم بھی مرہم بھی'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

افسانہ ''وہ بوڑھا'' ایک ایسے بوڑھے شخص کی داستان حیات ہے جس نے اپنی ساری زندگی ویرانوں کو آباد کرنے، اندھیروں میں دیا روشن کرنے اور نئی شاہراہوں کی تلاش میں گزار دیے۔ بوڑھا شخص اس عظیم روایت کی توسیع اور تحفظ میں آخری وقت تک کوشاں نظر آتا ہے تاکہ ویرانوں کو آباد کرنے، دیے روشن کرنے اور نئی شاہراہیں قائم کرنے کا کام اس کے بعد بھی جاری رہے۔ بوڑھا شخص پرانے اقدار کا نمائندہ ہے جس میں عزم، حوصلہ اور کچھ کرنے کا جذبہ ہے اس کے پاس زندگی کا مقصد اور آئیڈیل ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے اس نے آخری سانس تک تگ ودو کی جب کہ نئی نسل جو اس وراثت کی امین ہے اسے ان کاموں سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کی زندگی اپنے ذاتی عیش وآرام تک محدود ہے۔ جس کا اندازہ افسانے میں موجود اس نوجوان کے کردار سے ہوتا ہے جو بوڑھے کے پیغام کو عام کرنے اور اس روایت کی توسیع میں مارے مارے پھرنے کے بجائے ایک آرام پسند زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے۔

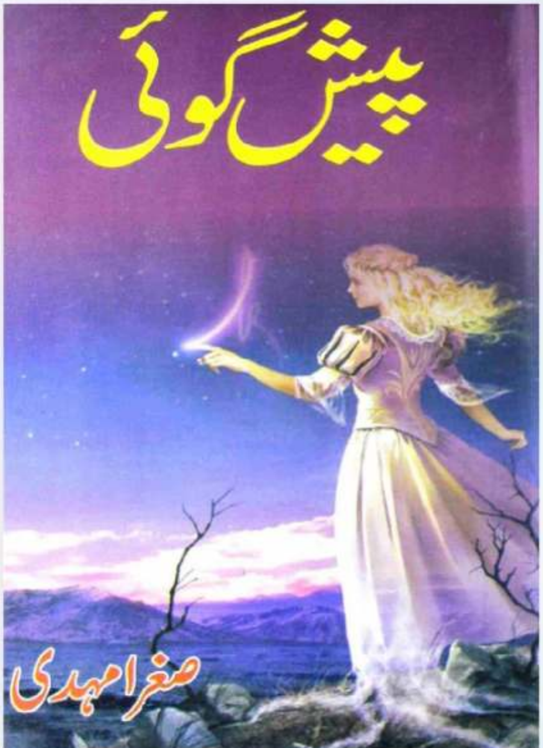

صغرا مہدی نے بوڑھے شخص کے احساسات وجذبات کے ذریعے اس سماج کا نقشہ پیش کیا ہے جہاں مادیت نے اخلاقیات پر غلبہ حاصل کرلیا ہے اس معاشرے کا ہر فرد اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے دست بردار کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کی ہوس میں مبتلا ہے۔ نمائشی طرز زندگی، شادی بیاہ کے موقع پر فضول خرچی، تعلیمی اداروں کی بدنظمی اور اصولوں کی ناقدری وغیرہ جدید عہد کا عمومی طرز حیات بن چکا ہے۔ افسانہ ''زخم بھی مرہم بھی'' میں ایک نوجوان شخص کی ذہنیت کو پیش کیا گیا ہے، جس کی نظر میں زندگی بس ایک سودا ہے، لین دین ہے، جس کا نہ کوئی اصول ہے نہ قانون اسے صرف اپنے ذاتی سکون کی خواہش اور فکر ہے۔ انٹرویو میں ناکام ہونے کی صورت میں اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو وہ اپنے اصول پرست والد کو لکھتا ہے۔ درج ذیل اقتباس نئی نسل کی نفسیات کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے:

''بابا میں ابھی ابھی انٹرویو دے کر آیا ہوں۔ اس مرتبہ بھی وہی ہوا، جس کی امید تھی۔ اس دفعہ چند ''کرسی نشین'' حضرات کے دعوے اردو شاعری کے محبوب کے وعدے ثابت ہوئے۔ اس کے آپ اس دنیا میں اونچے آدرش لے کر اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھانے

آئے ہیں۔ مگر بابا ان سے پیٹ نہیں بھرتا اور نہ ان آدرشوں کی کوئی قدر کرتا ہے۔ آپ شاید سن کر خوش نہ ہوں، مگر یہ ایک حقیقت ہے۔ مجھے نہ آپ کے مذہب پر یقین ہے نہ آپ کے آدرشوں پر، مجھے نہ آپ کے ملک سے دلچسپی ہے نہ قوم سے۔ مجھے نوکری چاہیے، پیسہ چاہیے۔ جس سے میں اپنے لیے، اپنی ماں کے لیے اپنے بھائی بہنوں کے لئے ضروریات زندگی مہیا کر سکوں، چین سے رہوں۔۔۔ میں تنگ آ گیا ہوں روز کے ان چکروں سے، بھاگ دوڑ سے۔۔۔'' (ص 25، زخم بھی، مرہم بھی)

صغریٰ مہدی کی بیشتر کہانیاں حیات انسانی بالخصوص بزرگوں کے احساسات وجذبات پر مبنی ہیں۔ عصر حاضر میں بزرگ کردار کی نفسیات، ان کے جذبہ واحساس، اور افکار وخیالات کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں بزرگوں کی داخلی کیفیات کی شناوری میں دسترس حاصل ہے جن کی جذبات نگاری کے ذریعے انھوں نے نہ صرف جدید عہد کی خامیوں کو بے نقاب کیا ہے بلکہ قاری کو غور وفکر پر بھی آمادہ کیا ہے۔ افسانہ ''پیش گوئی'' میں ایک بوڑھے شخص کے اندرونی کرب اور بے بسی کا اظہار درج ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے جب وہ اپنی بیوی سے کہتا ہے:

''کیا تم بھی یہی سمجھتی ہو کہ میں جو اصولوں کی بات کرتا ہوں، تو یہ میرا پاگل پن ہے؟ میں جو یہ چاہتا ہوں کہ سب کام ایسے ہوں جیسے ہونا چاہیے، غلط ہے۔ وہ قدریں جنھیں معاشرہ ٹھکرا رہا ہے، بے معنی ہیں؟'' (ص 16، پیش گوئی)

صغریٰ مہدی نے اپنے افسانوں کے ذریعے ہندوستانی تہذیب کے اعلیٰ اقدار کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیا۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان میں رائج بیشتر روایتیں سماج میں محبت، خلوص، ایثار، وفاداری، جانثاری اور آپسی بھائی چارگی کی فضا قائم کرتی ہیں جس سے سماجی اور تہذیبی نظام میں توانائی پیدا ہوتی ہے۔ افسانہ ''بزنس'' میں مالک اور ملازم کے مابین وفاداری اور ایمانداری جیسی مستحکم روایت کی شکست وریخت کو ایک بوڑھے ملازم میں خیالات کے ذریعے نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے اسی طرح افسانہ ''حویلی'' میں ہندوستانی تہذیب کے مٹتے آثار کو موضوع بنایا ہے اور دیہی مقام رام نگر میں آباد حویلی کو ان بزرگوں اور قدیم تہذیب کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ جس کا سلسلہ نسل در نسل صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ افسانے میں حویلی کا گرنا اور اجڑنا صدیوں پرانی اس تہذیب کے خاتمے کا اشاریہ ہے۔ جس کا آخری محافظ وہ بوڑھا ملازم ہے جس کے ذریعے نئی نسل کی عیش وعشرت، رنگینی اور اپنے بزرگوں اور حویلی کے تئیں بے رغبتی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مذکورہ افسانے میں صغرا مہدی نے سماج کی بدلتی ہوئی قدروں اور بدلتے ہوئے رشتوں کی عکاسی کی ہے۔

صغرا مہدی نے کئی افسانوں میں شہری اور صنعتی زندگی کے بالمقابل دیہات کی پر سکون زندگی کو اجاگر کیا ہے تیزی سے بدلتے ہوئے معاشرے اور گاؤں کی پر سکون یاد کو بہت ہی خوبصورتی سے افسانہ ''چھاؤں'' میں پیش کیا ہے۔ دیہات کی پرسکون فضا میں پروردہ اماں جی کا کردار شہر کی مشینی زندگی سے نالاں نظر آتا ہے۔ شہر آنے کے بعد وہ کبھی دیہات کی خاندانی محبت اور رواداری کو یاد کرتی ہیں کبھی مہمانوں اور اپنے عزیزوں کا ذکر کرتی ہیں جن کی آمد سے گھر کی رونق میں اضافہ ہوتا تھا اور کبھی گرمیوں کے موسم میں کورے گھڑے کے پانی کو ترستی ہیں۔ دادی اماں کے بالمقابل افسانہ نگار نے رفو کے کردار کے ذریعے شہر کی پر پیچ اور تیز رفتار زندگی کو پیش کیا ہے جو ایک پریس میں کام کرتی ہے۔ وقت بے وقت بوس کا فون، اماں کا چیک اپ، ڈرامے کا ریہرسل اور ٹرانسلیشن جیسی مصروفیات میں وہ اس قدر الجھی نظر آتی ہے کہ جب وہ وقت نکال کر دادی اماں کے پاس بیٹھتی ہے تو اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ:

'' وہ دادی اماں کے ساتھ گاؤں کی حویلی میں بڑے سے آنگن میں نواڑ کی پلنگڑی پر مدو کامنی کے نیچے لیٹی ہے اور

ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں، پورا آنگن مدو کامنی کی خوشبو سے مہک رہا ہے...... کس قدر سکون اسے.......''

(ص:50، چھاؤں)

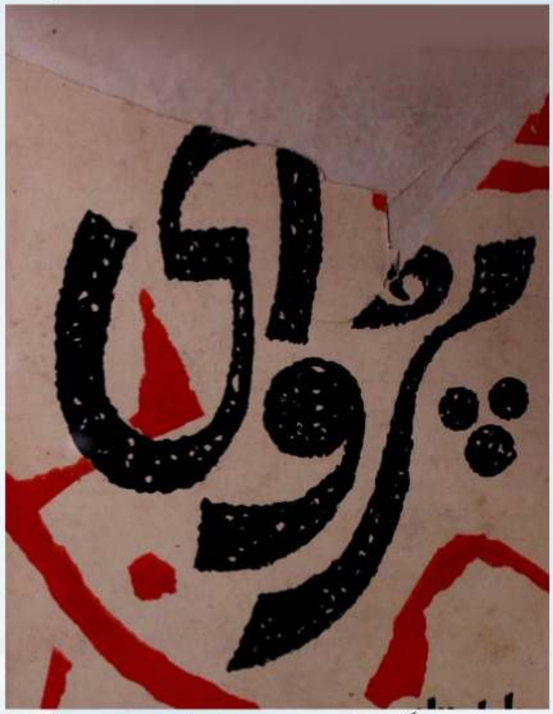

شہری زندگی پر مبنی ایک افسانہ ''دیوالی'' بھی ہے جس کا اہم کردار ایک نوجوان لڑکا ہے جو شہر کی لمبی پکی سڑکوں، بلند عمارتوں، موٹر گاڑیوں اور وہاں کی رنگینیوں سے متاثر ہو کر شہر آتا ہے لیکن یہاں آکر اس پر یہ راز کھلتا ہے کہ یہاں پڑھے لکھے لوگ بھی بھید بھاؤ کرتے ہیں۔ آئے دن فسادات، کرفیو، بم دھماکے اور جلوس وغیرہ اسے بہت خوفزدہ کرتے ہیں۔ مجید کو اپنا گاؤں یاد آتا ہے جہاں ہندو مسلم مل کر تیوہار مناتے ہیں۔ دیوالی کے موقع پر مجید دیوالی کا سامان لے کر اپنے گاؤں کے لیے روانہ ہوتا ہے لیکن راستے میں بس روک کر فسادی اسے مار ڈالتے ہیں۔ شہری زندگی کے اسی فسادات اور خوف و دہشت کی فضا کو افسانہ نگار نے ''دکھ کے دن اب بیتت نا ہے'' میں اماں جی کے حوالے سے نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اماں جی دیہات سے شہر کی طرف منتقل ہونے والی ایک ایسی عورت ہیں جو صبح سے شام تک روزانہ گیارہ منزلہ عمارت میں کبھی اپنے پوتے کے اسکول سے واپسی کا انتظار کرتی ہیں کبھی بہو اور بیٹی کے سلامتی سے واپس آنے کی دعائیں مانگتی ہیں وہ طرح طرح کے وہم اور خدشات میں گھری اس وقت تک اور پریشان نظر آتی ہیں جب تک کہ رات میں ان کا بیٹا سلامتی سے گھر واپس نہیں آجاتا ہے۔ صبح سے رات آٹھ بجے تک اماں جی کی یہی کیفیت رہتی ہے۔ کبھی وہ سڑک پر ہونے والے شور وغل سے خائف ہو جاتیں، کبھی فائر بریگیڈ کی آواز سے دہل جاتیں، پولس کی وین کی آواز سن کر کھڑکی سے خوفزدہ جھانکنے لگتیں۔ چوری، ڈکیتی، لوٹ مار، عصمت دری اور فسادات جیسی خبریں اماں جی کے ذہن و دماغ پر اس قدر حاوی ہو جاتی ہیں کہ وہ اپنے بیٹے، بہو اور بیٹی کے ہوتے ہوئے بھی بالکل خاموش خالی خالی نظروں سے سب کو تکا کرتی ہیں۔

نفسیاتی اعتبار سے یہ ایک عمدہ افسانہ ہے۔ شہری اور دیہی زندگی کے علاوہ اپنی زمین اور اپنے وطن سے محبت کا گہرا احساس بھی ان کے افسانوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ مادر وطن کی کشش، تہذیب سے علاحدگی کی کسک، اس سے اپنائیت اور محبت کا جذبہ افسانہ ''بن باس'' اور ''فیصلہ'' میں نظر آتا ہے۔ دونوں افسانے اسی نکتے پر دلالت کرتے ہیں کہ انسان اپنے ملک میں رہ کر ہر مشکلات کو ایک عزم، حوصلے اور اعتماد سے حل کر سکتا ہے اور اپنے ملک سے اسے جو عزت، محبت اور اپنائیت مل سکتی ہے وہ کسی دوسرے ملک سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

صغرا مہدی کی کہانیوں کا مقصد چونکہ سماج کی اصلاح ہے اس لیے ان کے اکثر کردار مثالی ہوتے ہیں جو جدید عہد میں خلوص و وفا، محبت و شفقت اور انسان دوستی کی فضا عام کرتے ہیں۔ اکثر کردار ان کی شخصیت کا عکس معلوم ہوتے ہیں جیسے افسانہ ''چھوٹی پھوپھی'' میں چھوٹی پھوپھی کے کردار میں افسانہ نگار کی شخصیت کی جھلک نظر آتی ہے، جو حق گوئی، بے باکی، اصول پرستی اور انسانیت کے جذبے سے پر ایسے کردار کے طور پر آتی ہیں جن کا مقصد ہی دوسروں کے کام آنا تھا جو دن رات طالب علموں اور ضرورت مندوں سے گھری رہتیں، رشوت خوری، بے ایمانی، ناانصافی اور بے اصولی سے انھیں چڑھتی وہ روشن خیال ہونے کے ساتھ ساتھ مذہب کی پاسدار بھی تھیں۔ ان کا نظریہ تھا کہ:

''دیکھو تبدیلی تو آنی چاہیے مگر اس کے ساتھ ہمیں زمانہ کی رو میں نہیں بہنا چاہیے اور کسی بات کے کرنے کا یہ کیا جواز ہے کہ سب کر رہے ہیں۔ اپنی تہذیب، اپنا کلچر اور اپنی شناخت ہونی چاہیے'' (ص73، چھوٹی پھوپھی)

چھوٹی پھوپھی کے ذریعے افسانہ نگار نے اخلاقی رجحانات کے ساتھ ساتھ سماجی صورتحال کی عکاسی کی ہے۔ اسی طرح '' یہ پر اسرار بندے'' میں سلمیٰ پھوپھی کی خاندانی وضعداری اور تعصّبات کے برعکس ایک ملازم کے تئیں ان کی محبت، ہمدردی اور ایثار و قربانی کو اجاگر کرنے کی کوشش

کی ہے۔

صغرا مہدی ایک حساس، گداز دل، انسان دوست، معاشرے کی

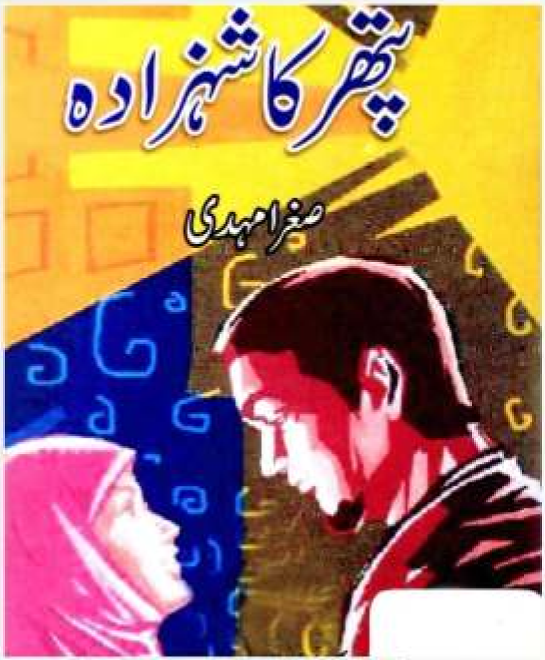

ناہمواریوں پر دل گرفتہ اور عورتوں کی زبوں حالی پر افسوس کرتی ہیں۔ وہ ایک ایسی فنکارہ کے طور پر سامنے آتی ہیں جن کے تخلیق کردہ تمام افسانوں میں انسانی اقدار کا احترام اور سماجی اصلاح کا مثبت تعمیری جذبہ ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔ افسانہ ''لبادہ'' میں انسان کے مکروفریب اور دوہرے مزاج کو ''دوہری پرچھائی'' میں ایک مرد کی نفسیاتی پیچیدگی کو ''گلابوں والا باغ'' میں طبقاتی تفریق کو ''جمع تفریق، حاصل'' میں ہندوستان کی بے روزگاری اور ''شیشے کے گھر'' میں ازدواجی زندگی کے نازک پہلوؤں کے علاوہ دیگر افسانوں میں حیات انسانی کے مختلف گوشوں کو بیان کرتے ہوئے انھوں نے اخلاقیات اور امتیازی انسانی اوصاف کو اجاگر کیا ہے۔

صغرا مہدی کے زیادہ تر افسانوں میں جاگیردارانہ عہد سے لے کر جدید عہد تک کی عورتوں کے بھی مختلف روپ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ عورت ہونے کی حیثیت سے انھیں خواتین کے احساسات وجذبات اور ان کے مسائل کا بخوبی علم تھا۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں متوسط طبقے کی عورتوں کے کردار کو پیش کیا ہے۔ افسانہ ''عزت'' میں ماں، بیٹی، بیوی کی شکل میں انھوں نے عورت کی بے بسی اور محرومی کو پیش کیا جو تینوں ہی روپ میں اپنے خاندان کی عزت کی خاطر اپنی ذاتی خوشیوں کو قربان کر دیتی ہے۔ ''ملبہ'' میں صدیوں پرانی اس عورت کی عکاسی ملتی ہے جو اپنے شوہر کے ظالمانہ رویے کے سبب بے حسی اور بے بسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ صغرا مہدی کی زیادہ تر کہانیاں خواتین کی زندگی کے ان پہلوؤں کے گرد گھومتی ہیں جہاں اس کا وجود آزاد نہیں ہے۔ اس کی اپنی کوئی شناخت نہیں ہے، اس گھٹے ہوئے معاشرے میں جب ایک عورت اپنی کوئی پہچان بنانے کی کوشش کرتی ہے تو اسے سماج میں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ افسانہ ''ساتویں لڑکی''، ''جو میرے وہ راجہ کے نہیں''، ''نمک حرام'' اور ''کہانی پارو کی'' کے کردار ایک باہمت اور روشن خیال عورت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ افسانہ نگار نے سارا، نازلی یاسمین اور پارو کے ذریعے مرداساس معاشرے پر چوٹ کی ہے اور مرد وعورت کی اس تفریق کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے عورت مجبور اور بے بس ہے۔ ''کہانی پارو میں'' پارو اپنی بہنوں کی روتی بسورتی زندگی دیکھ کر شادی کرنے کے بجائے رکشہ چلانے کو ترجیح دیتی ہے وہ کہتی ہے:

> ''بس زیادہ پارو پارو مت کرو اور کان کھول کر سن لو کہ میں
> رکشا اس لیے چلاتی ہوں کہ مجھے روٹی پکانا اچھا نہیں لگتا، مجھے
> برتن دھونا اچھا نہیں لگتا، مجھے مرد کی مار کھانا بھی اچھا نہیں لگتا،
> اور پارو وہی کرتی ہے جو اسے اچھا لگتا ہے۔

(ص:41، کہانی پارو کی)

صغرا مہدی نے آج کی ماڈرن اور مادہ پرست زندگی میں مرد وعورت کے باہمی رشتوں کو ''قسمت کی لکیر'' اور ''پتھر کے شہزادہ'' میں اجاگر کیا ہے جس میں عورت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہونے کے باوجود آج بھی مردوں کے ہاتھوں کا کھلونا بنی ہوئی ہے۔ افسانہ '' پتھر کا شہزادہ'' میں آرتھر ایک ایسا ہی کردار ہے جو محبت جیسے لطیف جذبات و احساسات سے عاری وقتی رفاقت اور دلچسپی کو ہی ترجیح دیتا ہے۔ اس کے خیالات کا اندازہ ان جملوں سے ہوتا ہے جب وہ صبا سے کہتا ہے:

> ''دیکھو بات یہ ہے کہ جب تک ہم ایک دوسرے کو چاہ سکیں،
> ایک دوسرے کو رفاقت دے سکیں، ساتھ رہیں زندگی بھر ایک
> دوسرے کو بھگتنے کے بجائے ہم چاہے تھوڑے عرصے ساتھ
> رہیں مگر ہنسی خوشی۔۔۔''

(ص101، پتھر کا شہزادہ)

''چوتھا کھونٹ'' میں بھی مرد وعورت کی اسی نوعیت کو پیش کیا ہے جس میں مرد کردار اپنے کنوارے پن پر فخر محسوس کرتے ہوئے متعدد لڑکیوں سے وقتی دلچسپی کو ترجیح دیتا ہے۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال لڑکی مادھوی کی اپنے تئیں وارفتگی اور دیوانگی کے باوجود اسے اپنانے سے

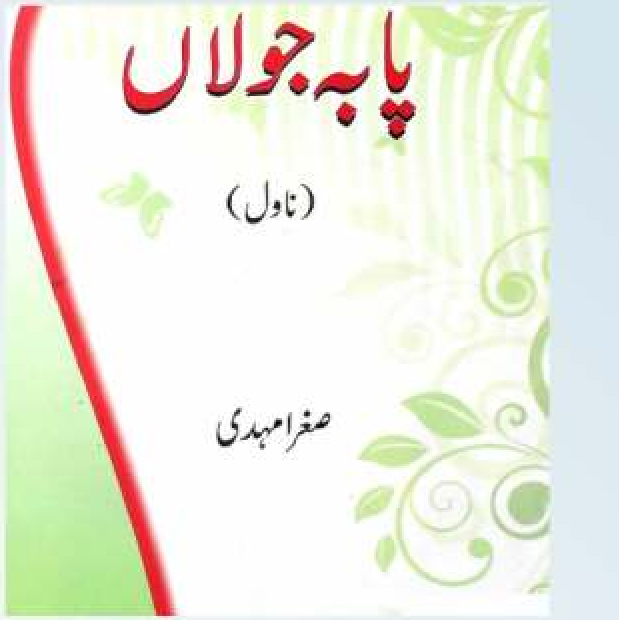

صرف اس لیے انکار کر دیتا ہے کہ اگر اس نے ایسا کیا تو اسے اپنا بہت سا وقت مادھوی کو دینا پڑے گا۔صغرا مہدی کے افسانوں کی اکثر عورتیں نسوانی احساسات وجذبات کی متحمل نظر آتی ہیں جو پدرانہ سماج میں اپنی شناخت اور حیثیت کے لیے کوشاں نہایت صبر وقناعت اور حوصلے سے زندگی گزارتی ہیں۔افسانہ نگار عورتوں کی حد سے بڑھی آزادی کی قائل نہیں ہیں۔افسانہ ''چوراہا'' میں آزادی کا بھرپور فائدہ اٹھانے والی لڑکی کے ذہنی کرب کو یاسمین کے ذریعے پیش کیا ہے۔

صغرا مہدی کے افسانوں میں ہندوستان اور ہندوستانیت، مشرق اور مشرقیت کی روح جلوہ گر نظر آتی ہے۔ان کا بنیادی زور انسانی اقدار اور احترام انسانیت پر ہے۔جس کی دریافت وہ خارجی حالات اور ماحول کے تغیرات واثرات کے درمیان نہایت فطری انداز میں کرتی ہیں۔

صغرا مہدی کے تمام افسانوں کی روشنی میں ان کے فکری کینوس کا احاطہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ دونسلوں کا ٹکراؤ، دیہی اور شہری زندگی میں تضادات، عصر حاضر کی پیچیدگیاں، خواتین کے مسائل، زوال پذیر قدریں، پامال ہوتے رشتے، معاشرتی نظام، فرد کی داخلی کشمکش وغیرہ ان کے افسانوں کے اہم موضوعات ہیں۔وہ ایک مصلح، حقیقت پسند، انسانیت اور انسانی قدروں کی علمبردار افسانہ نگار تھیں، جنھوں نے عصر حاضر کے مادی اور صارفی کلچر میں دو عہد اور دو تہذیب کے نظریۂ حیات میں تضادات کو ابھارتے ہوئے اپنے خالص اور اصلاحی جذبہ اور مقصد کے تحت، طبقاتی تفریق، منافقت، مکروفریب جیسی برائیوں اور خامیوں کو بے نقاب کیا اور ہندوستانی عظمت، حب الوطنی، بھائی چارگی اور انسان دوستی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ان کے افسانوں میں اعلیٰ انسانی قدروں کا میلان کسی نہ کسی طور پر موجود ہے۔

صغرا مہدی کی کہانیاں فکر وفن کے اعتبار سے تو نئی نہیں ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے شگفتہ اور بے ساختہ اسلوب کے سبب یہ کہانیاں ذہن ودل پر خوشگوار تاثرات پیدا کرتی ہیں۔گھریلو، مانوس فضا اور عام بول چال کی فطری زبان ان کے افسانوں کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہے۔اختصار نویسی ان کا حسن ہے جسے وہ اس خوبی سے بیان کرتی ہیں کہ بقول ڈاکٹر کملیش ''ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی گانے والا اپنے راگ میں الاپ سنوارتا ہے'' صغرا مہدی کے افسانوں میں جو چیز سب سے زیادہ متوجہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی زبان کرداروں سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہے۔

ہر افسانہ نگار کی تخلیق کے پس پشت ایک فلسفۂ حیات، انداز فکر اور نظریۂ حیات موجود ہوتا ہے۔جس میں خود تخلیق کار کی پسند ناپسند جھلکتی نظر آتی ہے۔صغرا مہدی کے افسانے ان کی شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں جس میں بے باکی اور حقیقت گوئی کے ساتھ ساتھ زندگی کی تصویر کشی، محبت کا درس اور سماج کی اصلاح کا جذبہ بھی پوشیدہ ہے۔ایک مصلح ہونے کی حیثیت سے انھوں نے افسانے کے بنیادی تقاضوں کا کم خیال رکھا ہے ان کے افسانوں کی خوبی یہی ہے کہ انھوں نے انسانیت سوز ماحول میں اعلی اقدار کی نشاندہی کرکے ذہن سازی کی عمدہ کوشش کی۔ڈاکٹر کملیش مجموعہ ''جو میرے وہ راجہ کے نہیں'' کے دیباچہ میں صغرا مہدی کے افسانوں کے متعلق یوں لکھتے ہیں:

> ''ان کی کہانیوں سے زندگی کے سفر میں منزل کا سراغ ملتا ہے، روشنی ملتی ہے، جینے کی کوشش میں پل پل مرتے انسانوں کی تھکن تھوڑی دیر کو ہی سہی مگر ختم ہو جاتی ہے۔پڑھنے والا کسی کردار کی کوشش وکامیابی کو اپنی کوشش وکامیابی سمجھے۔اس سے زیادہ کسی لکھنے والے کو اور کیا چاہیے''

❑❑❑

Somayya Bano
Research Scholar
Dept. of Urdu, Urdu Academy
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)

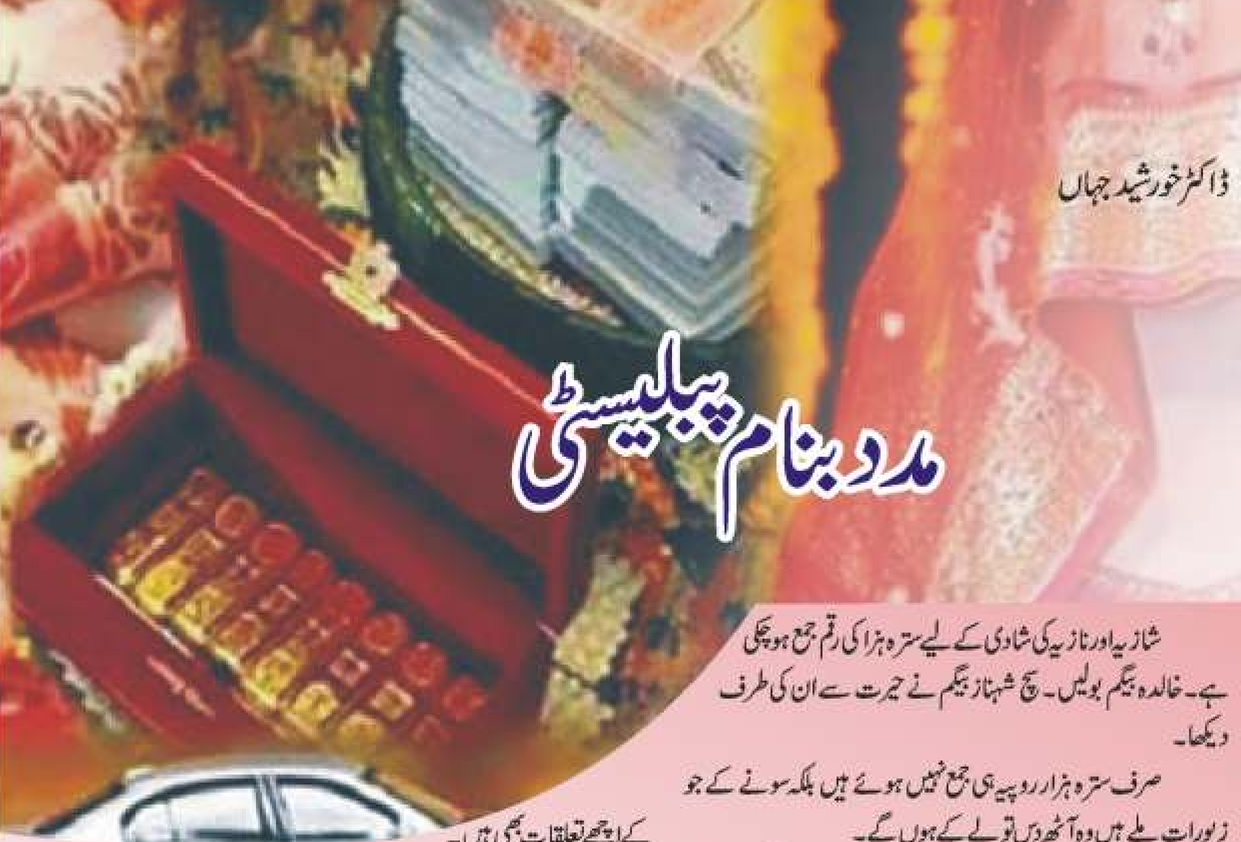

کہانی

مدد بنام پبلسٹی

ڈاکٹر خورشید جہاں

شازیہ اور نازیہ کی شادی کے لیے سترہ ہزار کی رقم جمع ہو چکی ہے۔ خالدہ بیگم بولیں۔ سچ شہناز بیگم نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

صرف سترہ ہزار روپیہ ہی جمع نہیں ہوئے ہیں بلکہ سونے کے جو زیورات ملے ہیں وہ آٹھ دس تولے کے ہوں گے۔

'یقین نہیں آ رہا ہے۔' شہناز بیگم کی حیرت دو چند ہو گئی۔ وہ کس لیے؟

خالدہ بیگم نے تعجب سے پوچھا۔ اس لیے کہ اس کچی آبادی میں جو لوگ رہتے ہیں ان کی مالی حالت اور حیثیت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ وہ کہنے لگیں۔ ان میں شاید ہی کوئی امیر، کبیر آدمی ہو۔ وہاں زیادہ تر ایسے لوگ رہتے ہیں جو ٹھیلہ اور خوانچے لگاتے ہیں۔ کوئی بس ڈرائیور، کنڈکٹر تو کوئی مل اور کارخانوں میں مزدوری کرتا ہے۔ لڑکیاں اور عورتیں اپنی گزر اوقات کے لیے سلائی کے کارخانوں میں کام کرتی ہیں یا پھر اپنے گھروں میں بیٹھ کر سلائی کے کام کاج کرتی ہیں۔ ان لوگوں سے سترہ ہزار روپیہ کی رقم جمع ہونا اور پھر زیورات کا دینا بہت بڑی بات ہے۔

آپ سچ کہتی ہیں خالدہ بیگم نے تائیدی انداز میں کہا۔ مجھے ان لوگوں کے جذبے نے بڑا متاثر کیا۔ اب انشاء اللہ ان یتیم بچیوں کی شادی احسن طریقے سے انجام پائے گی اور ہاں اگر تین ہزار کی رقم کا اور بندوبست ہو جائے تو بیس ہزار روپے ہو جائیں گے۔ دس۔ دس ہزار روپے دونوں لڑکیوں پر خرچ ہو جائیں گے۔ کیا آپ کہیں سے تین ہزار روپے کی رقم کا بندوبست کر سکتی ہیں؟ میرے خیال میں اس رقم کا بندوبست کرنا آپ کے لیے چنداں مشکل نہ ہوگا۔ اس لیے کہ آپ اونچے لوگوں میں اٹھتی بیٹھتی ہیں اور ان کی تقریبات میں شرکت کرتی ہیں۔ ان سے آپ کے اچھے تعلقات بھی ہیں۔

خالدہ بیگم نے ان کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ غلط نہ تھا۔ وہ ایک مشہور انگریزی رسالہ سے وابستہ تھیں جو خواتین سے متعلق تھا۔ اس لیے ان کا ڈیفنس سوسائٹی، ہاتھ آئی لینڈ گلشن' سر اقبال اور غالب روڈ کے علاقوں میں جو بنگلے اور کوٹھیاں تھیں، ان لوگوں کے ہاں آنا جانا تھا۔ ان سے اس رسالے کی وجہ سے گہرے مراسم ہو گئے تھے اور انھیں خاص طور پر مدعو بھی کیا جاتا تھا۔ انھوں نے شازیہ اور نازیہ کی شادی کے لیے سات سات قیمتی جوڑے بنا کر رکھ دیے تھے۔ شازیہ اور نازیہ اپنے والدین کے ساتھ کچی آبادی میں رہتی تھیں۔ ان کی ماں کھانا پکا رہی تھیں کہ اسٹوو پھٹ گیا۔ آگ بھڑک اٹھی۔ باپ بچانے گیا تو وہ بھی آگ کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دونوں آگ کی نظر ہو گئے اور ان بچیوں کی شادی کے لیے جو جہیز تھا وہ بھی جل گیا۔ لڑکیاں اس لیے بچ گئی تھیں کہ وہ گھر پر نہیں تھیں۔ کسی رشتے دار کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔ خالدہ بیگم نے ان بچیوں کی شادی کا بیڑا اٹھایا تھا۔ وہ کچی آبادی سے سترہ ہزار روپے اور سونے کے زیورات وصول کر کے لائی تھیں۔ اب تین ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ وہ سوچنے لگیں۔ تین ہزار کی رقم کس سے وصول کی جائے۔

دفعتاً انھیں اشتہار کا خیال آیا۔ انھوں نے مزید تین ہزار روپے جمع کرنے کے لیے شہناز بیگم سے کہا۔ جس پر شہناز نے نہ صرف اس کام کے لیے خوش دلی سے ہامی بھری بلکہ اس سلسلے میں وہ اپنی دوست صبا کے گھر

گئی۔ وہ اس شہر کے ایک صنعت کار سے بیاہی گئی تھی۔ اس کے لیے تین ہزار کیا تیس ہزار روپے بھی دینا مشکل نہ تھا۔ وہ انھیں بہت مانتی تھیں۔ دو تین دن میں انھیں ایک بار ٹیلی فون کرتی تو آدھے گھنٹے سے کم وقت نہیں لیتی تھیں۔ وہ جب بھی اس کے ہاں جاتی تھیں تو 'صبا' ان کی بڑی آؤ بھگت کرتی تھی۔

انھوں نے اس روز وہاں جا کر شازیہ اور نازیہ کی المناک کہانی سنا کر کہا۔ میں ان بچیوں کی شادی کے لیے تم سے تین ہزار کی رقم مانگنے آئی ہوں۔'

تین ہزار کی رقم...... صبا حیرت کے انداز میں بولی۔ کیا تم نہیں جانتی آج کل بزنس کا کیا حال ہے۔ دن رات کی ہڑتال اور کرفیو کی وجہ سے بزنس سارا چوپٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ پچھلے دو تین سال سے نقصان میں جا رہے ہیں۔ ظفر بڑی سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں کہ کیوں نہ فیکٹری بیچ کر دبئی میں یا سنگاپور میں کوئی کام شروع کر دیں۔

شہناز بیگم نے جیسے اپنے کان بند کر لیے۔ اب وہ صبا کی باتیں نہیں سن رہی تھیں۔ صرف اس کی باتوں کی گونج مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح ان کے دامن کے کسی گوشے میں گھوم رہی تھی۔ وہ اسی تقریب کے بارے میں سوچ رہی تھیں جو ایک مہینے پہلے صبا کے گھر ہوئی تھی۔ یہ صبا کی شادی کی دسویں سالگرہ تھی۔ اس تقریب کو وہ بھول نہیں سکتی تھیں۔

صبا نے زبردست پارٹی دی تھی۔ بیس پچیس ہزار روپے سے زیادہ خرچ کیے تھے۔ یہ سوچتے ہوئے انھیں بڑا دکھ ہو رہا تھا۔ صبا بولی۔ 'تم میری بات سن رہی ہو۔؟'

ہاں انھوں نے بے دلی سے سر ہلایا اور کہا کہ سمجھ میں نہیں آتا اس ملک کا کیا ہوگا۔ کرفیو، خون خرابے، دہشت گردی اور ہنگاموں کا یہی حال رہا تو ہم لوگ جائیں گے کہاں اب ہم یہاں رہ بھی کیسے سکتے ہیں؟

پھر وہ کچھ اور بیگمات کے پاس گئیں۔ شازیہ اور نازیہ کی کہانی نے ان کے دلوں پر کوئی اثر نہیں کیا۔ کسی نے سو روپے دیے تو کسی نے پچاس روپے۔ دس گھروں سے بارہ سو روپے جمع ہو سکے تھے۔ وہ دل برداشتہ ہو کر چلی آئیں۔

کوئی ایک ہفتہ کے بعد ہوٹل شراٹن میں منعقد ایک امدادی تقریب میں رسالے کی طرف سے گئی تھیں۔ اس تقریب میں ایک اسپتال کی تعمیر کے لیے چندہ وصول کیا جانے والا تھا۔ اس تقریب میں کرکٹ کے مشہور کھلاڑی شریک تھے۔ بلکہ فلم اور ٹیلی ویژن کے نامور اداکار اور اداکارائیں بھی شریک تھیں۔ اعلیٰ طبقے کی لڑکیاں اور بیگمات بھی آئیں تھیں۔ تقریب میں بڑی رنگا رنگی اور گہما گہمی تھی۔ انھیں صبا بھی دکھائی دی جو کسی فلمی اداکارا کی طرح سج دھج کر آئی ہوئی تھی۔

کرکٹ کے ایک سپر اسٹار بیٹسمین نے اپنے بلے پر اپنے آٹو گراف دیے۔ جس سے اس نے چوکے چھکے مارے اور کئی سنچریاں بنائیں تھیں۔ اسے نیلامی کے لیے پیش کیا تا کہ اس کی وصول کی رقم استعمال کے لیے دی جا سکے۔

اس کی بولی لگنا شروع ہوئی۔ انھوں نے دیکھا کہ اس بلے کی نیلامی بولی میں وہ بیگمات بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں جنھوں نے ان بچیوں کی شادی کے لیے سو پچاس روپے بڑی مشکل سے نکالے تھے۔ صبا بھی اس بولی میں بڑا جوش و خروش دکھا رہی تھی۔ جس کا شوہر دو تین سال سے کاروبار میں سخت نقصان اٹھا رہا تھا۔

صبا نے تین لاکھ روپیہ کی سب سے بڑی بولی دے کر یہ بلا حاصل کر لیا۔ وہ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ اس کے چہرے پر فتح مندی کی مغرور مسکراہٹ تھی۔ جیسے اس نے ساری دنیا کو شکست دے دی ہو۔ وہ اس وقت تک ایک کونے میں چپ چاپ کھڑی رہی۔ جب تک وہ ہر ایک سے مبارک باد وصول کر کے اور تصویریں کھنچوا کر فارغ نہیں ہو گئی۔ وہ صبا کا بازو پکڑ کر اسے ایک طرف لے گئیں تا کہ اسے خوب کھری کھری سنا سکیں۔ وہ اندر ہی اندر غصے سے کھول رہی تھیں۔ وہ اس پر برس پڑیں۔ ان غریب لڑکیوں کی شادی کے لیے تمھارے پاس تین ہزار روپے نہیں تھے۔ یہ بلا خریدنے کے لیے تین لاکھ روپے کہاں سے آئے۔

'اصل بات یہ نہیں ہے جانی' وہ ہنس کر بولی۔ تین ہزار روپے دینے سے مجھے کیا خاک پبلیسٹی ملتی۔ میں نے یہ بلا اسپتال کی تعمیر میں چندہ دینے کے لیے تھوڑی خریدا ہے۔ میں نے اپنی پبلیسٹی کے لیے خریدا ہے۔ ان تین لاکھ روپے کی وجہ سے پورے ملک میں جو پبلیسٹی ہوگی وہ تیس لاکھ روپے خرچ کرنے سے بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ سمجھیں۔؟ شہناز بیگم حیرت زدہ ہو کر سوچ رہی تھیں۔

یہ پبلیسٹی اس کے کس کام آئے گی۔

□□□

Dr. Khursheed Jahan
4A/58, Vishal Khand
Gomti Nagar
Lucknow-226010 (U.P)

دھند اور موسیقی

تبسم فاطمہ

'خالہ سلام۔ ہم آئے ہیں۔'

باہر کے مین دروازے سے یہ آواز ابھرتی تو میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ شکیل نام تھا۔ لیکن نام بگڑ کر شکلو ہو گیا تھا۔ شکلو کا اپنا کوئی کام دھندہ نہیں تھا۔ عمر تھی کوئی پچاس پچپن کی۔ ایک کام ہو تو بتائیں۔ سارے محلے کا کام کیا کرتا تھا۔ شکل پر پھٹکار برستی تھی۔ پان خوب کھاتا تھا۔ چائے اور پان کے لیے اسے پیسے چاہیے ہوتے تھے۔ جب ضرورت ہوتی وہ محلے کے کسی نہ کسی گھر میں پہنچ جاتا۔ بجلی اور پانی کا بل بھرنے سے لے کر ضرورت کے سارے کام آپ اس سے کرالیں۔ وہ اف تک نہیں کرتا تھا۔ شادی بیاہ کے موقع پر شکلو کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی تھی۔ وہ دس آدمی کا ایک آدمی تھا۔ سارا دن کام کرنے کے باوجود تھکن کا نام ونشان نہیں۔ لیکن صبح ہی صبح اس کی منحوس آواز سن کر مجھے غصہ آجاتا تھا۔ 'خالہ سلام، ہم آئے ہیں۔' 'ارے یہ ہم کیا ہوتا ہے۔ جیسے کہیں کے راجہ مہاراجہ ہوں۔ بڑے نواب ہوں......' مگر شکیل کی آواز سن کر اماں کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ جاتی......لو، آگیا بیچارہ۔ رات سے یاد کر رہی تھی۔ کتنا کام پڑا ہے۔ کوئی کرنے والا نہیں۔ چکی سے آٹا پسوانا ہے۔ بازار سے سبزی لانی ہے۔ بینک جانا ہے۔

اماں نکل کر ڈیوڑھی تک آجاتیں۔ 'ناشتہ کیا؟'

'ارے نہیں خالہ۔ اتنی صبح ناشتہ کون دے گا۔'

'پھر شادی کیوں نہیں کر لیتا۔'

'یہ ہے......خالہ۔ جب جوانی میں نہیں کی، تو اب بڑھاپے میں کیا کروں گا۔'

'اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ چل پہلے ناشتہ کرلے۔ پھر سامان لے کر آنا۔'

'یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے خالہ۔ بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ خالہ۔'

'ابھی بھجواتی ہوں۔'

شکلو کو اماں سے بہت عقیدت تھی۔ اماں بھی اس کو بہت مانتی تھیں۔ وقت کی دھوپ چھاؤں میں کئی چہرے ابھرے اور گم ہو گئے۔ لیکن طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی میں شکلو کو نہیں بھول سکی۔ شکلو سے وابستہ یادوں کی پٹاری میں ہزاروں قصے بند ہیں۔ کبھی کبھی مجھے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ شکلو بھی کسی طلسمی داستان کا کوئی کردار ہے۔ ایک ایسا کردار جو اپنے اندر کے زخموں کو کھولنا نہیں چاہتا۔ وہ ہر بات پر کھل کر ہنستا تھا......لو جی......خالہ کی سنو......خالہ آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں...... آہستہ آہستہ مجھے بھی شکلو سے ہمدردی ہوتی گئی۔

کہتے ہیں جب وہ اس محلے میں آیا تو اس کی عمر یہی کوئی پندرہ برس کی ہوگی۔ محلے کے ایک ڈاکٹر صاحب تھے جو اسے لے کر آئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ شکلو پر بہت ظلم کرتے تھے مگر شکلو نے نہ کبھی مدافعت کی نہ کسی سے کوئی شکایت۔ جب تک ڈاکٹر صاحب زندہ رہے، وہ ان کے پاس ہی رہا۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد ان کی اہلیہ نے شکلو سے کسی بات پر ناراض ہو کر اسے گھر سے نکال دیا۔ کچھ دن تک اس نے رکشہ چلایا۔ اس زمانے میں اس کو ٹی بی کی شکایت ہو گئی۔ محلے والوں نے علاج کرایا تو شکلو کی صحت بہتر ہونے لگی۔ اب اس واقعہ کو بھی مدت گزر چکی ہے اور اس کے بعد شکلو گھوم گھوم کر لوگوں کی خدمت انجام دینے لگا۔ جہاں کچھ مل جاتا، کھا لیتا۔ کبھی کسی کی شکایت نہیں کرتا۔ اس لیے پورا محلہ اس کا گھر تھا اور ہر گھر کے لیے اس کی موجودگی ایسے فرد کی تھی، جس کے نہ ہونے سے گھر کے چھوٹے بڑے کام رک جایا کرتے تھے۔ اس کے سونے کے لیے ہزاروں ٹھکانے تھے۔ رات ہی تو گزارنی ہوتی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک دن اماں کو اس پر رحم آگیا۔ گھر کے باہر کا حصہ اس کو دے دیا گیا۔ لیکن وہ سوتا کیا، ساری رات گھر کی چوکیداری کرتا رہتا۔ اماں کبھی پوچھتیں تو کہتا......زمانہ خراب ہے خالہ......چور ڈاکوؤں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ آپ کا نمک کھایا ہے خالہ......میرے رہتے کوئی گھر میں داخل کیسے ہو سکتا ہے۔؟

مجھے ایک ایک کر کے سارے منظر یاد آ رہے ہیں۔ کئی بار خیال آیا کہ اس سے اس کے بچپن کے بارے میں دریافت کروں۔ اس کے ماں باپ کون تھے؟ کہاں رہتے تھے؟ لیکن......کھی کھی......کھی کھی......وہ ہنسی

میں ساری بات کو اڑا دیتا۔ جیسے اسے اپنے ماضی میں کوئی دلچسپی نہ ہو یا وہ اپنے ماضی کو بھول کر بھی یاد نہ کرنا چاہتا ہو اور اسی لیے اس نے سارے محلے میں خود کو تقسیم کر دیا تھا۔ کبھی بازار جا رہا ہے۔ کبھی نل پر پانی کی بڑی بڑی بالٹیاں لے کر کھڑا ہے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر وہ ایک پاؤں پر کھڑا ہے۔ وہ ہر شخص بلکہ پورے محلے کے لیے ایماندار ہے۔ ایک بار محلے میں چودھری صاحب کی بیٹی کی شادی تھی۔ اچانک گھر میں ہنگامہ مچا کہ زیورات کا ایک ڈبہ غائب ہے۔ شکلو دو تین بار کسی نہ کسی سامان کے بہانے کمرے میں دیکھا گیا تھا۔ شکلو پر الزام لگایا گیا...... شادی کی ساری رسمیں مکمل ہو چکی تھیں۔ بیٹی کو گھر سے رخصت کرنے کی کارروائی باقی تھی۔ شکلو خاموش رہا۔ پولیس نے اسے حراست میں لے لیا۔ رخصتی کے بعد اچانک ہی وہ زیورات کا ڈبہ مل گیا۔ چودھری صاحب شرمسار ہو کر تھانے پہنچے۔ شکلو کو بلایا گیا۔ وہ ہاتھ جوڑے سامنے آیا تو چودھری صاحب کے ضبط کا باندھ ٹوٹ گیا۔

'تم نے چوری نہیں کی تھی تو پھر الزام اپنے سر کیوں لیا؟'

'اور کیا کرتا جی۔ بیٹی آپ کی تھی تو ہماری بھی تھی۔ رخصتی کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ کوئی ہنگامہ نہ ہو......'

'اور اس لیے تم نے الزام......'

'الزام کیا صاحب جی، آپ کیا جانیں، وقت نے کیسے کیسے الزام لگائے...... ایک افسوس رہ گیا صاحب جی......'

'وہ کیا......'

'رخصتی کے وقت بیٹا کو نہیں دیکھ سکا۔'

چودھری صاحب شکلو سے لپٹ کر رو پڑے۔ پھر آنسو پونچھے۔ 'بٹیا آئے گی تو سب سے پہلے تم سے ملے گی۔'

چودھری صاحب مسکرا رہے تھے۔ 'تو کیا چیز ہے رے شکلو۔ دبی زبان سے تو کہہ سکتا تھا کہ چوری تم نے نہیں کی۔'

'نہیں کہہ سکتا تھا چودھری صاحب۔ پھر آپ کسی اور پر الزام لگاتے۔'

وقت گزر گیا۔ میں دہلی آ گئی۔ ایک دن رات کے وقت فون آیا۔ فون شکلو کا تھا۔

'اماں کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔'

میرے جسم سے جیسے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا۔ 'اب طبیعت کیسی ہے اماں کی۔'

'یہاں بارش کافی ہو رہی تھی بی بی۔'

'اماں کی طبیعت کیسی ہے؟' میں زور سے چیخی۔

'آپ فکر نہ کریں بی بی۔ اماں اب ٹھیک ہیں۔ یہی بتانے کے لیے فون کیا تھا۔'

تفصیل مجھے دوسرے دن معلوم ہوئی۔ تیز بارش ہوئی تھی۔ گلی میں پانی بھر گیا تھا۔ اماں کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ نیم بیہوشی طاری تھی۔ اس بیہوشی کی حالت میں اکیلا سہارا شکلو تھا۔ وہ پانی میں بھیگتا ہوا ڈاکٹر کو لانے گیا۔ ڈاکٹر آنے کو تیار نہیں ہوا تو اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ 'میری اماں ہیں جی۔ بچے باہر ہیں۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ اماں کو بچا لیجیے۔' ڈاکٹر گھر پہنچا تو اماں کوما میں جا چکی تھیں۔ تین گھر چھوڑ کر چوتھے گھر والوں کے پاس ایک کار تھی۔ شکلو نے منت سماجت کی۔ اماں کو اسپتال لے کر گیا۔ اور پھر دوسرے دن اماں کو لے کر گھر آ گیا۔ اماں کی طبیعت اچھی تھی۔ میں نے فون کیا۔ فون پر شکلو تھا...... میں رو رہی تھی......

'شکلو...... تم...... آپ...... آپ کیا چیز ہیں شکلو......'

'بی بی گھر کا نمک کھایا ہے۔ اللہ کے یہاں جواب بھی تو دینا ہے۔'

شکلو کو جواب دینے کی بہت جلدی تھی۔ اس رات پانی میں بھیگ کر وہ بیمار ہو گیا تھا۔ پھر بیماری بڑھتی چلی گئی۔ اس نے ڈاکٹر کو نہیں دکھایا۔ خود ہی اپنی بیماری سے لڑتا رہا۔ اماں نے بہت کہا لیکن وہ ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ ایک رات اچانک فون کی گھنٹی بجی تو میں ڈر گئی۔ فون گھر سے تھا۔ بس اتنا بتایا گیا...... شکلو نہیں رہا۔ میں فون کا ریسیور تھامے ہوئے دیر تک کسی پتھر کے مجسمے کی طرح بت بنی رہی۔ او ہنری کی کہانی ''آخری پتا'' مجھے یاد آ رہی تھی۔ ایک بیمار لڑکی جو کھڑکی کے باہر ایک درخت کو دیکھتی رہتی ہے اور کہتی ہے، جس دن آخری پتا ٹوٹے گا، وہ مر جائے گی۔ تیز بارش ہو رہی ہے۔ ایک ناکام پینٹر اس رات پانی میں بھیگتا ہوا اپنا شاہکار بناتا ہے۔ آخری پتہ۔ درخت کے پتے تو کب کے جھڑ گئے تھے۔ لیکن اس شاہکار نے بیمار لڑکی کی زندگی کو بچا لیا تھا۔ بارش میں بھیگنے سے پینٹر کو ٹائیفائیڈ ہو گیا اور وہ مر گیا۔ شکلو مر گیا اماں کی زندگی بچ گئی۔

ایسے لوگ وقت کے گھنے کہرے میں چھپنے کے باوجود بھی یاد رہ جاتے ہیں۔ میں دھند میں ہوں...... یادوں کی پرچھائیوں کے درمیان ایک موسیقی ہے جو ذہن میں گونج رہی ہے...... وحشت سے بھری اس دنیا سے باہر نکل کر میں کچھ دیر اس موسیقی میں گم رہنا چاہتی ہوں۔

□□□

Tabassum Fatima
D-304 Taj Enclave
Geeta colony

چشمہ فاروقی

غرور اور اعتماد

اس نے کئی بار خودکشی کرنے کا ارادہ کیا مگر ہر بار اپنی بیوی کی بیوگی اور بچوں کی یتیمی کے خیال نے اسے اس گناہ سے باز رکھا۔ وہ خود بھی یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ مایوسی کفر ہے اور یہی بات اس کی بیوی نے دلاسہ دیتے ہوئے کئی بار کہی............

ایک وقت تھا۔ جب اس کی آسودگی اور خوشحالی میں لوگ اسے رزاق بھائی رزاق بھائی کہتے نہیں تھکتے تھے اور اس کی خاطر مدارات میں کوئی کمی نہیں کرتے تھے۔ مگر جب تقدیر روٹھ گئی اور بربادی نے اس کے گرد ایسا جال کس دیا کہ اسے ناکردہ گناہ میں جیل کی سزا بھی کاٹنی پڑی۔ اپنی رئیسی میں اس نے کئی لوگوں کو بھاری رقم کے قرض دیے تھے جواب وصولی کیے جانے پر بھی دستیاب نہیں ہو رہے تھے۔ شراکت داروں نے ایک دم سے منہ پھیر لیے۔ پہلے جہاں اسے دیکھتے ہی 'ارے رزاق بھائی آؤ آؤ' کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور ٹھنڈے مشروبات کے ڈھکن بنا خواہش کے ہی کھل جاتے تھے آج وہی لوگ اسے بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہتے تھے اور بہانے کر کے اسے ٹال دیتے۔ بھائی ذرا بزی ہوں ایک ہفتہ بعد ملنا وغیرہ وغیرہ۔ ان حالات میں پہنچنے کی وجہ ضرور اس سے کوئی بڑا گناہ سرزد ہوا ہے۔ جس کی سزا اللہ اس طرح دے رہا ہے۔ اس کا یہ حال کہ جس گھر میں پہلے مہمانوں کے لیے لنگر ہوا کرتا تھا اب دانے دانے کو وہ اور اس کے بچے ترس رہے تھے۔ اس کے اچھے برے کرموں میں ایک برا کرم صرف اتنا یاد تھا کہ وہ دولت کے نشے میں بہت مغرور ہو گیا تھا۔ شاید یہ اسی کی سزا ہے۔ اسے دکھ اس بات کا بھی تھا کہ اگر ساس سسر ہوتے تو اپنی بیٹی کے اس دکھ میں ضرور ساتھ دیتے۔ اب تو بس ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ اچھی قیمت پر فلیٹ کو بیچ کر کسی دوسری جگہ چلا جائے۔ وہ دو ماہ پہلے ہی سزا کاٹ کر لوٹا تھا۔ یہ سزا اسے کئی کروڑ کی غیر ملکی کرنسی رکھنے کے جرم میں ملی تھی جس کے متعلق وہ سرے سے کچھ نہیں جانتا تھا اور وہ سارا مال اور شرارت اس کے ان پارٹنر کی تھی جن پر وہ اندھا اعتماد کرتا تھا اور جنھیں زمین سے اٹھا کر آسمان کی بلندی تک پہنچایا تھا اور جواب اس کی تمام تجارتی جگہوں کے مالک بنے بیٹھے تھے۔ اس کی اس غلطی کی وجہ یہ تھی کہ اس نے انھیں پاور آف اٹارنی دے رکھی تھی۔

ایک دن صبح ہی صبح اس کے فلیٹ کی گھنٹی نے انھیں چونکا دیا۔ بیوی نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک باپردہ خاتون کو کھڑے پایا جس نے دیکھتے ہی سلام کر کے پوچھا رزاق بھائی گھر پر ہیں؟ بیوی نے ہاں میں جواب دیا تب وہ عورت بولی میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ ہاں ضرور اندر تشریف لائیں۔ بیوی نے مسکراہٹ کے ساتھ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے اندر بلا لیا۔ دروازہ بند کر کے اس نے اجنبی عورت کو کرسی پر بٹھایا اور شوہر کو آواز دی، اے جی دیکھو تو کون تم سے ملنے آیا ہے؟ اپنے کمرے سے جب رزاق بھائی نکل کر ڈرائنگ روم میں آئے تو برقع والی کو دیکھ کر چونک گئے اور سوالیہ نظروں سے بیوی کی طرف دیکھنے لگے جس پر بیوی نے بھی کاندھے اچکا کر ہونٹوں کے اشارے سے لاعلمی ظاہر کی۔ عورت نے انھیں دیکھتے ہی سلام کیا اور دونوں کے اشاروں کو سمجھ کر کہا گھبرائیں نہیں رزاق بھائی، میں دبئی سے آئی ہوں اور اس سے پہلے کہ میں آپ کو اپنا نام پتہ اور کام بتاؤں، آیئے سب ناشتہ کرتے ہیں، کیونکہ میں نے اب تک ناشتہ نہیں کیا۔ ارے بھئی حیرت سے منہ نہ تکیے بچوں کو اٹھایئے، منہ ہاتھ دھلایئے

اور ناشتہ تناول فرمایئے۔ اس عورت نے اس انداز میں کہا جیسے وہ میزبان ہو اور گھر کے مالک مہمان۔ اتنی دیر میں وہ زمین پر بیٹھ گئی اور اس نے اپنے تھیلے سے تمام ناشتہ کی چیزیں نکال کر سلیقے سے سجادیں۔ زمین پر قالین پہلے ہی بچھا تھا، شاید دسترخوان کی ضرورت اس نے محسوس نہیں کی۔ ناشتہ کی خوشبو نے ان کی بھوک کو مزید بڑھا دیا تھا، لیکن وہ اب بھی حیرت کا پتلا بنے اسے دیکھے جا رہے تھے۔ ارے بھئی میرا نام حبیبہ ہے اور آپ لوگ میرے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ پہلے آپ میرے ساتھ ناشتہ کرلیں، ورنہ سب ٹھنڈا ہو جائے گا، چلو جلدی کرو۔ وہ ابھی حیرت سے سوچ رہے تھے کہ یہ کون رحمت کا فرشتہ بن کر آ گیا کہ حبیبہ نے بیگم رزاق کا نام لے کر کہا آمنہ بھابھی اب چلیے بھی کہہ تو دیا کہ ناشتہ کے بعد سب کچھ بتاؤں گی۔ اس کی زبانی اپنا نام سن کر وہ بری طرح چونک گئی۔ یہی حالت رزاق بھائی کی بھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد سبھی ناشتہ کرتے نظر آرہے تھے۔ ویسے بھی انھیں مدتوں بعد اتنا لذیذ ناشتہ کرنا نصیب ہوا تھا۔ ناشتہ کے دوران جہاں خاموشی چھائی رہی وہیں گھر والوں کے دلوں کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا کہ یہ فرشتہ صفت کون ہے؟ کیا چاہتی ہے؟ اور کس نے اسے بھیجا ہے؟

ناشتہ سے نپٹنے کے بعد پہلے چائے کا دور چلا جو حبیبہ تھرمس میں بھر کرلائی تھی۔ پھر حبیبہ کرسی پر بیٹھ کر بولی ہاں اب بتاتی ہوں ساری حقیقت، سنیے اور اس کے سنانے سے پہلے رزاق بھائی نے اپنے دونوں بچوں کو اندر کمرے میں بھیج دیا۔ وہ اب تک حبیبہ سے ایک لفظ بھی نہیں بولے تھے۔ پھر وہ اس سے پہلی بار مخاطب ہوئے۔ تم ہمیں کیسے جانتی ہو جب کہ ہم نے تمھیں آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میں بھی کہاں آپ کو جانتی پہچانتی ہوں، یہ تو سب اللہ کے فضل سے اس نے کیا ہے جو آپ لوگوں کو اچھی طرح جانتا پہچانتا اور مانتا ہے اور وہ میرا بہنوئی ہے اور ہمارے ساتھ دبئی میں مقیم ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے سوال کا جواب دیا۔ تمھارے بہنوئی کا کوئی نام تو ہوگا؟ وہ بے نام نہیں ہے۔ پہلے میں مختصراً اپنی حقیقت بتاتی ہوں پھر آپ کو اس کا نام بھی معلوم ہوجائے گا۔ میں اسی ملک کی بیٹی ہوں۔ حیدرآباد میرا وطن ہے، آٹھ سال پہلے میری شادی دبئی کے ایک امیر عرب سے کردی گئی۔ پہلے وہ العشام کے نام سے جانا جاتا تھا بعد میں ہمارا بیٹا صلاح الدین کے پیدا ہونے پر لوگ اسے 'ابوصلاح' کے نام سے بلانے لگے۔ میرے شوہر ایک ایسے تاجر ہیں جن کی تجارت کئی ملکوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ میرے شوہر نیک پرہیزگار اور سخی ہیں۔ میں ان بدنصیب بیٹیوں میں سے نہیں ہوں جن کی شادی ان کے باپ دادا کی عمر کے لوگوں سے کر دی جاتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میرے مقدر کا جوڑا ہم عمر عطا کیا۔

"شاید دیر سے ہی اللہ نے اس تحقیر اور تکبر کا انتقام اس صورت میں ان سے لے لیا اپنے غرور کو ہی یاد کر کے انہوں نے آمنہ کو وہ لفافہ اور رقم لینے کا اشارہ کر دیا تھا۔ انہوں نے لفافہ کھولا جس میں ایک ڈرافٹ اور ایک خط لکھا ہوا تھا۔ ڈرافٹ پر نظر پڑتے ہی ان کے ہوش اڑ گئے اور ان کے منہ سے نکلا 'او خدا نہیں!!!' انہوں نے جلدی سے خط کھولا اور اسے پڑھنے لگے"

خیر چھوڑیے اس بات کو۔ ہمارے پاس کئی ہندوستانی اور دیگر غریب ممالک کے لوگ کام کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک نوجوان ممبئی سے تین سال پہلے ہمارے پاس کام کرنے آیا جو کہ بڑا ہی خوبصورت، ایماندار، محنتی اور نرم طبیعت کا مالک تھا۔ اس نے میرے دل میں اس قدر جگہ بنالی کہ میں نے اسے اپنی چھوٹی بہن کے لیے پسند کرلیا۔ یہ بات میں نے اپنے شوہر کو بتا دی، وہ بہت ہی خوش ہوا۔ ویسے بھی وہ اس کے کام سے بہت خوش تھے۔ اس کی ذہنی صلاحیت ایک سلجھے ہوئے تاجر کا پتہ دیتی تھی۔ اتفاق سے وہ کنوارہ بھی تھا۔ میرے شوہر نے بہانے سے اس کے سامنے ہمارا ارادہ ظاہر کردیا۔ پہلے تو وہ جھجکا پھر تھوڑی پس وپیش کے بعد وہ راضی ہوگیا۔ بس پھر کیا تھا نیک کام میں دیری کیسی ہم لوگ اسے لے کر پہلے یہاں ممبئی آئے اس کے والدین کی رضامندی لے کر انھیں ساتھ لے کر حیدرآباد گئے اور سادگی سے ایک تقریب میں نکاح کردیا گیا۔ نکاح کے بعد ہم تینوں لوٹ گئے اور کچھ ماہ بعد میری بہن بھی وہیں آگئی۔ اب ہم دونوں وہاں ساتھ ہی رہتے ہیں اور میرے بہنوئی کا عالم اب یہ ہے کہ وہ ہمارے سارے کاروبار کا بے تاج بادشاہ ہے۔ وہ پوری ایمانداری کے ساتھ اپنے تمام فرائض کو بخوبی نبھا رہا ہے۔ چونکہ دبئی میں اس علاقے کے کافی لوگ ہیں جو اس سے ملنے آتے رہتے ہیں۔ انھیں کی زبانی تمھاری گرفتاری کا علم ہوا تو وہ تڑپ گیا، مگر کیونکہ اس وقت دولت تمھارے گھر کی باندی تھی اس لیے وہ تمھاری بے گناہ گرفتاری پر صرف افسوس کرکے رہ گیا۔ اس کے بعد اس نے تمھارے ہر حال پر نظر رکھنی شروع کردی اور جب تمھیں سزا ہوئی تو وہ اور بھی پریشان ہوگیا۔ اس نے تمھارے گھر کی کفالت بھی کرنی چاہی تھی۔ اس نے اس وقت بھی یہی سوچا کہ تمھارا کاروبار کافی پھیلا ہوا ہے، جہاں

سے ہر ماہ کرایہ بھی کئی ہزار آتا ہوگا، اس لیے وہ رک گیا۔ مگر اب جب اسے اپنے والدین اور دوستوں سے پتہ چلا کہ تمھارے ہی پارٹنرز نے تمھیں ہر طرح سے تباہ و برباد کیا ہے کہ تم دانے دانے کو محتاج ہو چکے ہو، تب اس نے اس صورت میں کہ اپنے ماں باپ سے ملنے ہندوستان آرہی ہوں اس نے ایک خط اور کچھ رقم مجھے تمھیں دینے کے لیے کہا، میں تمھاری امانت اس کے لکھے پتے پر تمھیں سونپنے کے لیے آئی ہوں۔ یوں تو ممبئی ساری دیکھی بھالی ہے۔ میرے شوہر اور بیٹا ساتھ ہیں وہ لوگ ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں اکیلی تم لوگوں سے ملنے آئی ہوں کیونکہ آج شام کی فلائٹ سے ہمیں حیدرآباد جانا ہے، اس لیے صبح صبح تکلیف دینے آگئی۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوئی تھی کہ رزاق بھائی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر اس سے پہلے ہی وہ عورت پھر بول پڑی ہاں ہاں گھبرایئے مت، میں اس کا نام بھی بتائے دیتی ہوں، جو تمھاری طرح تقریباً 40 سال کا صحت مند آدمی ہے اور جس نے تمھاری نوجوانی میں ہی اپنے دماغ سے کاروبار میں کافی ترقی کی تھی اور جو تمھاری ہی طرح بے وفا اور دغاباز دوستوں کی غداری کا شکار ہو کر مجبوری میں دبئی کام کرنے آگیا۔ ہاں مگر وہ کسی فراڈ یا کسی کیس میں کبھی ملوث نہیں ہوا، اس کا نام ہے 'عبدالرحمٰن جانی'، یہ کہہ کر حبیبہ نے ایک بند لفافہ اور کچھ رقم جو کہ ایک لاکھ لگ رہی تھی آمنہ بھابھی کے ہاتھ میں رکھ دی جسے لیتے ہوئے وہ ہچکچائی مگر شوہر کی نظروں کو سمجھ کر لے لیا اور پھر چند ہی لمحوں میں حبیبہ سلام و پیام اور شکریہ قبول کر کے واپس لوٹ گئی۔

خط اور نقد رقم جب آمنہ نے شوہر کو دینا چاہا تو انھوں نے لفافہ لے لیا اور رقم الماری میں رکھنے کو کہا۔ خط کھلنے سے پہلے وہ ماضی کے ان دنوں کو یاد کرنے لگے جب جانی اور وہ ایک ہی کام میں ایک ساتھ آئے تھے اور دونوں ہی ایک دوسرے کے حریف بھی تھے۔ دونوں نے اپنی عقل ذہانت اور محنت سے خوب مال کمایا۔ اس دولت کا نشہ جانی پر تو نہیں چڑھا مگر وہ خود بے حد مغرور ہو گئے اتنا کہ جب اچانک ہی جانی کے دغاباز دوستوں کے ذریعے وہ خالی ہو گیا تب وہ اس کے پاس مدد مانگنے آیا تھا جس پر طنز کرتے ہوئے بڑے غرور اور تکبر کے ساتھ کہا تھا۔ پہلے میرے جوتے صاف کر پھر چاہے جتنی مدد مانگ دوں گا۔ اپنے اسکول کے ساتھی، اپنی برادری اور ہم پیشہ دوست کی زبانی یہ جملہ سن کر وہ الٹے پاؤں لوٹ گیا، جسے انھوں نے بڑی تحقیر آمیز نظروں سے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ شاید دیر سے ہی اللہ نے اس تحقیر اور تکبر کا انتقام اس صورت میں ان سے لے لیا۔ اپنے غرور کو ہی یاد کر کے انھوں نے آمنہ کو وہ لفافہ اور رقم لینے کا اشارہ کر دیا تھا۔ انھوں نے لفافہ کھولا جس میں ایک ڈرافٹ اور ایک خط لکھا ہوا تھا۔ ڈرافٹ پر نظر پڑتے ہی ان کے ہوش اڑ گئے اور ان کے منہ سے نکلا 'او خدا نہیں!!!' انھوں نے جلدی سے خط کھولا اور اسے پڑھنے لگے۔

پیارے رزاق! میں تمھارے حالات بیان کر کے تمھیں شرمندہ نہیں کرنا چاہتا۔ ہم دونوں ایک ہی حادثے کا شکار ہوئے ہیں۔ میں پہلے اور تم بعد میں لیکن میں نے ہمت اور حوصلہ نہیں ہارا۔ تقدیر نے ساتھ دیا اور آج تمھاری دعا سے میں پہلے سے بھی زیادہ ترقی کر گیا۔ انشاء اللہ جلد ہی تم بھی اس مقام تک پہنچ جاؤ گے، مگر اب اندھا اعتماد کرنا اور جی حضوریوں اور چاپلوس قسم کے لوگوں سے ہوشیار رہنا۔ تم کل بھی میرے لیے عزیز دوست تھے آج بھی ہو اور انشاء اللہ ہمیشہ رہو گے۔ یہ چھوٹا سا نذرانہ اپنے بھائی کی طرف سے قبول کر لو، انشاء اللہ خیر کی برکت ہوگی۔ یہ قرض نہیں یہ ایک دوست کا فرض ہے جو وہ ادا کر رہا ہے تمھارا بھائی جانی۔

خط پڑھ کر ان کی آنکھیں بھیگ گئی اور ان کے منہ سے نکلا میرے دوست میرے بھائی مجھے معاف کر دے، میں واقعی دولت کے نشے میں اندھا ہو گیا تھا۔ اپنی اوقات اور اللہ کی نظر عنایت کو بھول بیٹھا تھا۔ بھول گیا تھا کہ دولت ہمیشہ کسی کے پاس نہیں رہتی، آج ہے تو کل نہیں۔ میرے دوست تیری دوستی تیری مخلصی تیری فراخ دلی کو میرے کروڑوں سلام۔ میں تم سے ملنے اور تمھارا قرض لوٹانے ضرور آؤں گا۔ انشاء اللہ، اللہ تمھیں سلامت شاد و آباد رکھے۔ آمین!

وہ اللہ کا نام لے کر اٹھے اور ایک نئے ولولے اور جوش کے ساتھ عبدالرحمٰن جانی کے 50 لاکھ کی بھیجی رقم سے پھر سے بازار میں اترے تو پھر سے ایک بار پھر ان کی طوطی بولنے لگی۔ اب انھوں نے ہر دغاباز سے کٹی کاٹ کر اپنے بل پر اپنے کاروبار کو فروغ دیا۔ نئے قابل اعتماد لوگوں کو اپنے ساتھ رکھا۔ اب ایک بار پھر سے رزاق بھائی کی آواز گونجنے لگی۔ اب وہ صرف مخلص لوگوں سے میل ملاپ رکھنے لگے۔ جب کاروبار پوری طرح جم گیا، حالات سدھر گئے تب انھوں نے اپنے محسن سے ملنے کی ٹھانی۔ اور آج وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ ٹور کے بہانے اپنے مخلص دوست محسن کو اطلاع دیے بغیر دبئی جا رہے تھے۔ اس سے ملنے اس کا قرض ادا کرنے کے لیے اور اپنا فرض بھی۔

□□□

Chashma Farooqui
25/3 Joga Bai
Jamia Nagar
New Delhi-110025

تبسم آرا

بحث اور انا

آج زمین اتنی سبز اور آسمان اتنا صاف کیوں ہے؟ سڑکیں زیادہ چوڑی معلوم پڑ رہی ہیں اور ہوائیں تسکین بخش۔ یہ نظارے پہلے بھی موجود تھے یا آج کچھ زیادہ مہربان ہیں؟ کھلا کھلا آسمان پھیلی سی زمین، پودوں میں پھول پیڑوں پر پھل، چڑیوں کی موسیقی۔ انسان کے زندہ رہنے سے لے کر کے تفریح تک کا ہر سامان موجود ہے۔ قدرت نے ذرہ ذرہ میں اپنی روشنی بکھیر رکھی ہے۔ پھر انسان کیوں غمگین اور اداس رہتا ہے؟ یا پھر شاید آج فضاؤں کی خوشگواری صرف مجھ پر ظاہر ہو رہی ہے، تب ہی تو نل کا پانی مجھے جھرنے جیسا معلوم ہو رہا تھا۔ پھر یکایک میرے خیال نے کروٹ بدلی تو اک اداس، روتا ہوا چہرہ سامنے آیا جو بالکل میری شکل سے ملتا تھا۔ دراصل وہ میں ہی تھی۔ کھلے آسمان اور چوڑی سڑکوں پر آنے سے پہلے میں مقید تھی ایک کمرے میں، ایک کمرہ جس میں صرف چار دیواریں نہیں تھیں بلکہ ایک دروازہ اور دو کھڑکیاں بھی تھیں، جن کے کھلے ہونے کے سبب باہر کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ اصلاً وہ قید تھی میرے خیالوں کی۔ میرے خیالوں نے مجھے پرت در پرت اندر تک قید کر رکھا تھا۔ ایک ایسی قید جس میں ہوائیں بھی تنگ تھیں۔

"عابدہ.......خالہ سے پتہ لگاؤ، وہ لوگ کہاں رہ گئے؟ لڑکی والے ہو کر بھی ہم سے پہلے نہیں آئے۔ انھیں تو اور پہلے آنا چاہیے، یہاں ہوٹل کا انتظام دیکھنا چاہیے۔"

عامر کی امّی نے اونچی آواز میں کہا۔

"جی امّی ابھی فون کیا تھا میں نے۔ خالہ سے بات ہوئی ہے میری۔ وہ کہہ رہی تھیں تسنیم نے تیار ہونے میں دیر کر دی۔"

"اتنا وقت لگتا ہے تیار ہونے میں؟ کوئی پہلی بار تو نہیں دیکھ رہے ہیں ہم لوگ اسے۔ خیر، اور ہاں تسنیم کو بھابی کہنے کی عادت ڈالو۔ آج منگنی کے بعد سے اسے بھابی کہنا شروع کرو۔ مانا کہ وہ تمھارے ساتھ کی ہے لیکن اب وہ تمھارے بھائی کی ہونے والی بیوی ہے تو تم اس سے عزت سے پیش آؤ گی، سمجھی۔"

"جی سمجھی۔"

"ثنا، تسنیم آ گئی"

عامر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پانچ سال گزر گئے اس بات کو اور اگلے تین مہینوں میں ہماری شادی بھی ہونے والی تھی۔ ان پانچ سالوں میں ہمارا رشتہ بہت گہرا ہو چکا تھا۔ ہوتا بھی کیوں نہ ان سالوں میں ہم کبھی ملے تو نہیں لیکن ایک بھی دن ایسا نہیں گزرا جب ہم لوگوں نے فون سے بات نہ کی ہو اور جب کبھی وہ رانچی آتے تو ان کا دیدار بھی ہو جایا کرتا۔ وہ اتنے حسین و جمیل ہیں کہ ان کو دیکھنے سے ہی آنکھوں کو ٹھنڈک مل جاتی تھی۔ گورا رنگ، کالی آنکھیں، سفید دانت، گلابی لب، کالے اور گردن تک لمبے بال۔ لمبائی کچھ خاص نہیں تھی، اور ناک شاید موٹی، گول گول سی۔ لیکن میں صرف ان کی آنکھ کو ہی دیکھ پاتی تھی۔ ان کی چمکتی آنکھوں کے سوا کچھ اور دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جب وہ میرے مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے بازار جاتے تو میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے ان کو دیکھ لیا کرتی تھی۔ ان کا مکان ہمارے

"میری بحث انا تک کبھی نہ پہنچتی اگر عامر نے یہ نا کہا ہوتا کہ وہ مجھ جیسی لڑکی سے کوئی رشتہ نہیں رکھیں گے جو اپنی ضد کے آگے کسی کی نہ سنتی ہو......اب میں ان کے لیے ان کی زندگی، ان کا جنون، ان کی تسنیم کی جگہ 'مجھ جیسی لڑکی' بن چکی تھی۔میں جانتی ہوں انا نے کسی کا گھر آباد نہیں کیا۔لیکن میرے اندر بھی ایک دنیا بستی ہے۔میری خواہش، میرے جذبات، میرا دکھ، میرے درد، میری خوشی، میرا غم، میرے خیالات اور میرا وجود اس کے علاوہ بھی اور جانے کیا کیا۔میری خواہش ضد؟اور ان کا کہا، حکم!میں نے تو صرف ان سے اپنی ایک خواہش کا ذکر کیا تھا اور امید کی تھی کہ وہ میرے فیصلے پر اپنے اقرار کی مہر لگا دیں گے"

گھر سے کافی قریب تھا لیکن آٹھ یا دس سال پہلے وہ لوگ رانچی چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے تھے۔اب وہ لوگ وہیں رہتے ہیں۔کبھی کبھی آنا جانا ہو جاتا ہے۔میرے ابّی کہتے ہیں، یہ رشتہ میرے لیے نہایت موزوں ہے۔چار لوگوں پر مشتمل چھوٹا سا خاندان، خالو اور عامر دونوں کی اچھی سروس، خالہ کا نیک دل ہونا، ان کا شہر میں رہنا وغیرہ وغیرہ۔یہاں میرے ابّی کی خواہش نے اقرار کی شکل لی اور وہاں وہ لوگ تیار ہو گئے۔رشتہ پکّا!

آج سے پہلے تک سب کچھ ٹھیک تھا۔میری اور عامر کی کسی بات کو لے کر دو رائے نہیں ہوئی۔مجھے بھی وہ سب پسند تھا جو انھیں پسند تھا یا جو انھوں نے کہا۔انھوں نے کہا میٹرک کے بعد مجھے سائنس کی جگہ آرٹ پڑھنا چاہیے۔آرٹ زندگی گزارنے کا بہترین فن ہے، میں نے مانا۔انھوں نے کہا مجھے غیروں سے پردہ کرنا چاہیے تا کہ کسی اور کی نظریں مجھ پر نا پڑیں، مجھے خود پر غرور ہوا۔انھوں نے کہا مجھے اپنی سہیلیوں کے ساتھ بس سے دھکّے کھاتے ہوئے کالج نہیں جانا چاہیے بلکہ گھر سے کالج تک رکشہ سے جانا چاہیے، مجھے ان پر ناز ہوا۔انھوں نے کہا مجھے بی۔اے کے بعد آگے پڑھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ مجھ سے اور زیادہ دنوں تک دور نہیں رہ سکتے۔وہ جلد از جلد مجھے اپنے نکاح میں لانا چاہتے ہیں، میں نے ان کے جذبات کی قدر کی۔

میری بحث انا تک کبھی نہ پہنچتی اگر عامر نے یہ نا کہا ہوتا کہ وہ مجھ جیسی لڑکی سے کوئی رشتہ نہیں رکھیں گے جو اپنی ضد کے آگے کسی کی نہ سنتی ہو............اب میں ان کے لیے ان کی زندگی، ان کا جنون، ان کی تسنیم کی جگہ 'مجھ جیسی لڑکی' بن چکی تھی۔میں جانتی ہوں انا نے کسی کا گھر آباد نہیں کیا۔لیکن میرے اندر بھی ایک دنیا بستی ہے۔میری خواہش، میرے جذبات، میرا دکھ، میرے درد، میری خوشی، میرا غم، میرے خیالات اور میرا وجود۔اس کے علاوہ بھی اور جانے کیا کیا۔میری خواہش ضد؟اور ان کا کہا، حکم!میں نے تو صرف ان سے اپنی ایک خواہش کا ذکر کیا تھا اور امید کی تھی کہ وہ میرے فیصلے پر اپنے اقرار کی مہر لگا دیں گے۔لیکن ان کے انکار نے میری چھوٹی سی خواہش کو میری "آزادی کا مسئلہ" بنا دیا۔میں نے تین مہینے جیسی چھوٹی سی مدّت کے لیے ایک کورس جس میں لڑکیوں کو تحفظِ ذات اور خود مختاری کا ہنر سکھایا جاتا ہے، کرنے کی اجازت مانگی تھی۔یہ کورس کرنے کی مجھے کیا ضرورت ہے۔عامر کے اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔میں سچ میں نہیں جانتی مجھے اس کی کیا ضرورت ہے۔شاید وہ ٹھیک کہتے ہیں۔آج سماج میں عورتوں کے ساتھ جو دوہرا رویہ اختیار کیا جا رہا ہے، جو ظلم کیا جا رہا ہے اس کی شکار ہر عورت نہیں ہے۔اس کی مثال انھوں نے مجھ سے دی۔وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔مجھے کسی چیز کی کمی نہیں ہے اور آگے بھی اس کی امید تھی کیوں کہ عامر کا گھر تو میرے گھر سے بھی اچھا اور خوشحال ہے۔

ویسے تو میں نے بات کی شروعات یہ مان کر کی تھی کہ عامر کا انکار میرا اقرار ہو گا لیکن بات جانے کب بحث بن گئی اور بحث نے تکرار کا روپ اختیار کر لیا۔کاش عامر نے میری خواہش کے اظہار پر یہ کہا ہوتا کہ تمھیں اس کی کیا ضرورت، میں ہوں تمھارے ساتھ تمھارا محافظ بن کر۔کاش......

"عامر میرے کالج کے پاس ہی ایک نیا ادارہ کھلا ہے۔جس میں لڑکیوں کو ان کی صلاحیت کے مطابق نئے نئے ہنر سکھائے جاتے ہیں تاکہ وہ خود مختار اور تحفظِ ذات کے لیے تیار ہو جائیں۔"

"اچھا یہ تو اچھی بات ہے۔" عامر نے بڑے سلیقے سے جواب دیا۔

’’میری ساری سہیلیاں کر رہی ہیں تو میں بھی ان میں شامل ہو جاتی ہوں۔‘‘

اگر ریسیور فون میں چہرہ دیکھ پانے کی صلاحیت ہوتی تو وہ دیکھ پاتے کہ میں نے کس معصومیت سے اور کیسے مجرمانہ انداز میں اپنی آنکھوں اور لبوں کو تہہ دار بناتے ہوئے اور زبان کو اپنے دانتوں تلے دباتے ہوئے یہ الفاظ نکالے تھے۔

’’تم کیا کروگی ایسا کورس کرکے‘‘۔ جواب ملا۔

’’کیوں......میں بھی خود مختار ہونا چاہتی ہوں، اپنی حفاظت آپ کرنا چاہتی ہوں‘‘۔

’’تمھیں کس سے خطرہ ہے؟‘‘ انھوں نے سوال کیا۔

’’کسی سے نہیں۔‘‘ میں نے جواب دیا اور تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد پھر کہا۔

’’اچھا اگر آپ کبھی مجھ پر جبر کرنا چاہیں تو۔‘‘

’’تو تمھیں مجھ پر اعتبار نہیں۔‘‘

’’اعتبار تو اپنے اعمال سے دلانا ہوتا ہے جس کے لیے ابھی تین مہینے اور کچھ دن باقی ہیں۔‘‘ میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

’’اتنے سالوں میں تم مجھے نہیں جان سکی۔‘‘ انھوں نے تیور بدلتے ہوئے کہا۔ اب میں تھوڑا سہم گئی، میرا لہجہ نرم ہو چکا تھا لیکن میں نے اپنی بات کو جاری رکھا۔ میں ان کی باتوں سے ان کے انکار کی وجہ جاننے کی کوشش کر رہی تھی جو میں آج تک نہ جان پائی۔

’’میں تو بس اپنی خواہش کا اظہار کر رہی ہوں اور یہ صحیح بھی ہے۔‘‘

’’تو تمھاری نظر میں میں غلط ہوں۔‘‘

’میں نے ایسا نہیں کہا۔ میں تو اپنی بات منوانے کی کوشش کر رہی ہوں۔‘‘ جواب میں مجھے صرف خاموشی ملی۔ کچھ لمحہ سوچنے کے بعد میں نے پھر کہنا شروع کیا۔

’’میں نے ہمیشہ آپ کی بات مانی ہے اس بار آپ مان جائیے۔ آخر مجھے بھی حق..........‘‘ ابھی میری بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ انھوں نے مجھے بیچ میں ہی روکتے ہوئے کہا۔

’’تو تم چاہتی ہو کہ اس بات کے لیے میں تمھارا احسان مند رہوں؟‘‘

’’نہیں نہیں میں نے ایسا تو نہیں......‘‘

’’سنو میری بات مجھے تمھاری خواہش پسند نہیں۔ تم اگر میری سننا چاہتی ہو تو تمھیں اپنی یہ خواہش چھوڑنی ہوگی اور میری بات مان کر مجھ سے رشتہ قائم رکھنا ہوگا یا اپنی بیکار سی خواہش کی خاطر اس بیکار سے کورس میں نام لکھوانا ہوگا اور ہاں ساتھ میں یہ بھی یاد رکھنا کہ میں تم جیسی لڑکی سے کوئی رشتہ نہیں رکھنا چاہوں گا جو اپنی ضد کے آگے کسی کی نہ سنتی ہو۔‘‘

مجھے فیصلہ کرنا ہی پڑا اور میں نے اپنے باہر کی دنیا کی جگہ اپنے اندر کی دنیا آباد کی اور نکل پڑی اس چار دیواری اور اپنے سوچ کی تہہ دار قید سے باہر۔ وہاں جانے سے پہلے اور وہاں پہنچنے تک میں نہایت گھبرائی ہوئی تھی کیوں کہ جمود کا فلسفہ درپیش آرہا تھا۔ سو قدم کی دوری کو ہزار قدم کا فاصلہ بناتے ہوئے جب میں وہاں پہنچی تو بہت سی لڑکیاں اور عورتیں اس ادارے کے آنگن میں ایک صف میں کھڑی تھیں۔ میں بھی ان میں شامل ہو گئی۔ سامنے سے ایک لیڈی رونماہ ہوئیں۔ ان کی شخصیت نے سب کو اپنی طرف مائل کیا۔ لمبا قد، سانولا رنگ، گردن تک چھوٹے بال، کاٹن کی ساڑی جسے اچھے سے پہنا گیا تھا، سر کے اوپر چشمہ لگا ہوا، ایک ہاتھ میں قلم دوسرے میں ایک کاغذ کا ٹکڑا۔ انھوں نے آتے ہی کہنا شروع کیا۔

’’ہم سب جانتی ہیں کہ ہم عورتیں اندر سے کتنی مضبوط اور بلند ارادے والی واقع ہوئی ہیں۔ اگر سماج میں عورتوں کو نا سمجھ پانے کی بات ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہی قوت ہے۔ یہی لامحدود قوت جس کا اندازہ بھی کوئی نہیں لگا سکتا لیکن اس کے باوجود سچ یہ بھی ہے کہ ہم جسمانی طور پر کمزور واقع ہوئی ہیں جس کے سبب ظلم و جبر اور مار پیٹ کا شکار بنائی جاتی ہیں۔ اسی لیے ہمارے ادارے نے یہ فیصلہ لیا ہے کہ ہم نہ صرف آپ کو روزگار کے ہنر سکھائیں گے بلکہ آپ کو اپنی حفاظت آپ کرنے کے گر بھی بتائیں گے جس سے آپ کی ورزش بھی ہو جایا کرے گی اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ورزش انسان کے صحت مند رہنے کے لیے کتنی ضروری ہے........

اس کے آگے بھی وہ بہت کچھ کہتی رہیں لیکن اس کے آگے مجھے کچھ سنائی نہیں دیا اور زیادہ سننے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ میرا ڈر بالکل ختم ہو چکا تھا۔ مجھے ایک نئی قوت کا احساس ہو رہا تھا۔ وہاں سے واپس آتے وقت قدرتی نظارے مجھے اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ میں عامر جیسے کسی بھی شخص کو اپنا غلام بنا سکتی ہوں مگر اسے اپنا آقا قبول نہیں کر سکتی۔

Tabassum Ara
C/o. Md Israfil
Vill Rudalpur, Post Jalalpur Bazar
Dist.Chhapra
Saran-Bihar-841412

ریحانہ خاتون

جہیز

جہیز کے نام پر
لمحاتی خوشی دینے والے
قیمتی ساز و سامان
کس کام آئیں گے؟
جو دائمی مسرتوں سے
ہمکنار کردے
جو لبوں پہ تبسم کے قوسوں کو
طویل کرنے کا عزم رکھے
حالات کی کڑی دھوپ میں جو
برگد کی گھنی چھاؤں بنے
زندگی کے ہر معاملے میں
جو ہمیشہ شریک ہو
ایسی شریکِ زندگی ہی
بیش قیمت جہیز ہے!

ایک سہاگن کے خواب

میرے ہمدم، میرے سرتاج!
تم وہاں ریت کے جزیرے میں
پچھلے تین برسوں سے
اک محل بنانے کے
خواب بُن رہے ہو
اور میں یہاں
ہر رات اپنی پلکوں پہ
تمھاری آمد کے خواب
سجاتی ہوں
آخر ان خوابوں کی تعبیر
بتاؤ سچ کب ہوگی
اور اتنے حسین خوابوں کا
خون کر کے
جو محل تم یہاں بناؤ گے
کیا پائیدار ہوگا؟

Rehana Khatoon
59, Chuna Shah Colony
P.O.: Maango, Jamshedpur-831012.

مرد کا اعتراف

اے میری شریکِ زندگی
تیرا وجود
لائقِ صد احترام ہے کہ
مرد و زن کی تجسیم میں
باوجود مختلف تفریق کے
یہ اعتراف ہے مجھ کو
کہ تُو میرے وجود کا ہی
ایک اٹوٹ حصّہ ہے
تیری تخلیق بھی تو
میری ذات کی مرہونِ منّت ہے
گویا میں بھی
تیرے بغیر نامکمل ہوں

انمول

ترے حصول کی خاطر
بہت سے لوگ
چند روپیوں کے عوض
اپنے لختِ جگر کو
بیچ دیتے ہیں
تو کتنی انمول ہے بیٹی

Rehana Khatoon
59, Chuna Shah Colony
P.O.: Maango, Jamshedpur-831012.

کلپنا چاؤلہ کے لیے

میمونہ علی چوگلے

کلپنا تو آہنی عزم رکھنے والی
کیسی صنفِ نازک تھی
ہر لڑکی کا خواب بنی تو
اور اَب خود ہی خواب ہوئی
آسمانوں کو چھونے کی تیری یہ خواہش
جانے کن وسعتوں میں گم ہوئی
کیوں ہوا یہ سانحہ
دم بخود ہے سارا جہاں
اخبار سارے لت پت ہیں تیرے خون سے
آسمان کی یہ اُڑان
چاند تاروں کی پہچان
تجھ کو راس نہ آئی کیوں
ہر طرف ہے یہی سوال
کلپنا تو ہے لازوال!!

کتابیں

فیکس، کمپیوٹر
جگہ لے نہیں سکتے کتابوں کی
کتابیں گھر کی الماری میں نہیں رہتیں
ہماری یادوں میں جیتی ہیں
جب بھی دل بے چین ہو جائے
لپک کر میں پرانی کتابوں کی الماری میں
اپنے آپ کو کھوجتی ہوں
کہیں کوئی سوکھا پتہ تو کہیں کوئی پھول
یادوں میں یوں ہلچل مچاتا ہے
کہ میں اس صفحہ کو گھنٹوں تکتی رہتی ہوں
اپنے اس سرمایہ کو سینے سے لگا کر لیٹ جاتی ہوں
تو ایسا لگتا ہے کوئی انجانا سا سایہ
میرے ساتھ رہتا ہے

Maimuna Ali Chougle
304 B Panch Dhara
Panch Marg, off Yari Road
Versova Mumbai- 400061 (MS)

لذیذ پکوان

فیرنی کیریمل سوس کے ساتھ (Feerni with Caramel Sauce)

تازہ دودھ ایک لیٹر، چینی ایک پیالی، چھوٹی الائچی چھ عدد، بادام ابلے اور باریک کٹے ہوئے دس عدد، پستے ابلے اور باریک کٹے ہوئے پندرہ عدد، چینی ایک چائے کا چمچ، چنے کی دال ایک چائے کا چمچ، چاول چار کھانے کے چمچ

کریمل بنانے کے لیے:

پانی دو کھانے کے چمچ، چینی چار کھانے کے چمچ

1. پہلے چھوٹی الائچی کو چینی کے ساتھ ملا کر پیس لیں۔
2. اب ایک دیگچی میں تازہ دودھ اور چھوٹی الائچی ڈال کر اچھی طرح پکا کر گاڑھا کرلیں۔
3. پھر بھیگے ہوئے چاول بالکل باریک پیس کر دودھ میں ڈال دیں۔
4. ساتھ میں چینی بھی شامل کر کے چمچ چلاتے رہیں۔
5. جب فیرنی گاڑھی ہونے لگے تو اسے اتار کر مٹی کے برتن میں ڈال کر جمائیں۔
6. آخر میں اوپر ابلے اور باریک کٹے پستے اور ابلے اور باریک کٹے بادام ڈال دیں۔
7. اب چینی اور پانی ملا کر کیریمل بنائیں اور فیرنی کے اوپر ڈالیں۔
8. مزے دار کیریمل والی فیرنی تیار ہے۔

آلو کچوری

آلو ایک پاؤ، زردے کا رنگ ایک چٹکی، ہری مرچ چار عدد، پانی چار کپ، سونف ایک چائے کا چمچ، کارن فلور ایک کھانے کا چمچ، کلونجی آدھا چائے کا چمچ، نمک آدھا چائے کا چمچ، رائی دو چائے کے چمچ، لال مرچ دو چائے کے چمچ (کُٹی ہوئی)، ہرا دھنیا دو کھانے کے چمچ، سرکہ چار کھانے کے چمچ

کچوری بنانے کے لیے:

سفید آٹا دو سو پچاس گرام، چنے کی دال آدھا کپ (اُبلی ہوئی)،

چاٹ مصالحہ ایک چائے کا چمچ ،لال مرچ آدھا چائے کا چمچ (پسی ہوئی)، زیرہ آدھا چائے کا چمچ (بھنا ہوا)،اجوائن آدھا چائے کا چمچ ،نمک آدھا چائے کا چمچ ،تیل تلنے کے لیے

1. آلو کاٹ کر اُن میں پانی ، رائی ، نمک ، ثابت لال مرچ ، سونف ، کلونجی ، زردے کا رنگ ، ہرا دھنیا اور ہری مرچ ڈال کر بیس منٹ ہلکی آنچ پر پکائیں۔

2. اب ان میں کارن فلور گھول کر شامل کریں۔

3. جب وہ گاڑھا ہو جائے تو ہر کہ ڈال کر چولہا بند کر دیں۔

4. کچوری بنانے کے لیے:

ایک برتن میں سفید آٹا لے کر پانی کی مدد سے آٹا گوندھ لیں۔

اُبلی چنے کی دال میں پسی لال مرچ ، بھنا زیرہ ، اجوائن ، چاٹ مصالحہ اور نمک ڈال کر مکس کریں۔اب آٹے کے پیڑے بنا کر ان میں دال بھریں اور اوپر آئل لگا کر بیس منٹ رکھ دیں۔آخر میں اُن کی چھوٹی چھوٹی کچوریاں بنا کر گرم تیل میں تلیں۔مزے دار آلو کچوری تیار ہے۔

دہی بھلے

دہی بھلے کے لیے:

ماش کی دال ایک کپ ، نمک ایک چوتھائی چائے کا چمچ ، بیکنگ سوڈا ایک چٹکی ، تیل تلنے کے لیے ، دہی دو کپ ، ہرا دھنیا دو کھانے کے چمچ ، بھنا زیرہ ایک چائے کا چمچ ، ادرک آدھا انچ کا ٹکڑا ، نمک حسب ذائقہ ، لال مرچ دو چائے کے چمچ ، چینی دو چائے کے چمچ

سجاوٹ کے لیے:

املی کی چٹنی دو کھانے کے چمچ ، ہرا دھنیا دو کھانے کے چمچ

1. دال کو دھو کر رات بھر کے لیے بھگو دیں۔دال کو چھان کر پیس لیں اور اس میں نمک اور بیکنگ سوڈا شامل کر دیں۔

2. کڑاہی میں تیل کو تیز گرم کریں اور بھلوں کو سنہرا ہونے تک تل لیں۔

3. تمام بھلے تلنے کے بعد نیم گرم پانی میں پانچ سے دس منٹ کے لیے بھگو دیں۔

4. پھر ہلکے ہاتھ سے پانی نچوڑ کر ڈش میں رکھ لیں۔

5. ایک پیالے میں دہی کو اچھی طرح پھینٹ لیں۔

6. اس میں نمک ، لال مرچ ، چینی ، باریک کٹا ادرک ، بھنا زیرہ پاؤڈر اور ہرا دھنیا بھی مکس کر لیں۔

7. ڈش میں رکھے بھلوں پر مصالحے والی دہی اتنی ڈالیں کہ بھلے چھپ جائیں۔

8. دہی بھلوں کو املی کی چٹنی اور ہرا دھنیے سے سجا کر پیش کریں۔

چنا چاٹ

کابلی چنے دو سو پچاس گرام اُبلے ہوئے ، آلو ایک کپ کیوبز اور اُبلے ہوئے ، ہری مرچ چار عدد باریک کٹی ہوئی ، پیاز آدھا کپ باریک کٹی ہوئی ، لیموں کا رس دو کھانے کے چمچ ، چینی ایک کھانے کا چمچ ، زیرہ ایک کھانے کا چمچ بھنا اور کٹا ہوا ، لال مرچ ایک چائے کا چمچ پسی ہوئی ، لال

مرچ ایک چائے کا چمچ کٹی ہوئی ، چاٹ مصالحہ ایک چائے کا چمچ ، نمک ایک چائے کا چمچ ، ٹماٹر ایک عدد باریک کٹا ہوا ، ہرا دھنیا دو کھانے کے چمچ ، املی کی چٹنی آدھا کپ تیار کی ہوئی ، پاپڑی ایک کپ کچلی ہوئی

1. ایک پیالے میں کابلی چنے ، آلو ، ہری مرچ ، پیاز ، لیموں کا رس ، چینی ، زیرہ ، پسی لال مرچ ، کٹی لال مرچ ، چاٹ مصالحہ ، نمک ، ٹماٹر اور ہرا دھنیا ڈال کر مکس کریں۔

2. اب اس پر ہرا دھنیا ، املی کی چٹنی اور پاپڑی ڈال کر سرو کریں۔

(بحوالہ:khanapakana.com)

ہماری غذا

شکیل احمد

غذا ہر جاندار کی پہلی اور سب سے اہم ضرورت ہے۔ قرار حمل کے ساتھ ہی جنین کو غذا ملنے لگتی ہے۔ یہ غذا اس کو ماں کے خون سے فطری طور پر حاصل ہوتی ہے۔ بچے کی پیدائش سے قبل ہی اس کی غذا کا انتظام قدرتی طور پر اس کی ماں کے سینے میں دودھ کی شکل میں ہو جاتا ہے، جس کی ترکیب بچے کی فطرت کے عین موافق ہوتی ہے اس وقت اس دودھ سے بہتر بچے کے لیے کوئی غذا نہیں۔ اس عمر میں بچے کے دانت نہیں ہوتے اس لیے غذا بھی ایسی ہوتی ہے جس کو چبانے کی ضرورت نہیں۔ یہ رقیق غذا آسانی سے ہضم ہو جاتی ہے۔ جیسے جیسے بچہ بڑا ہوتا جاتا ہے اس کی غذائیں بھی بڑھتی اور بدلتی جاتی ہیں۔ پھر اس کو چبانے کی ضرورت ہوتی ہے تو دانت نکلنا شروع ہوتے ہیں۔

قدرت نے دنیا میں مختلف النوع غذائیں پیدا کی ہیں۔ ہر غذا خوبی اور غذائیت لیے ہوئے ہے۔ ہر شخص کو ہر غذا میسر نہیں اس لیے قدرت نے ایک ہی قسم کی خوبی اور غذائیت کئی غذاؤں میں پیدا کر دی۔ پھر حالات اور وسائل کی بنا پر عادات غذا بھی بن جاتی ہیں۔ عمر، حالات، آب وہوا اور ضرورت کے لحاظ سے مختلف غذاؤں کی ضرورت پڑتی ہے۔ عمر اور ضرورت کے مطابق ہاضمہ کی قوت بھی بدلتی رہتی ہے۔ وہ غذائیں جن کو انسان جوانی میں، جب کہ وہ خوب محنت کا کام کرتا ہے ہضم کر لیتا ہے، بڑھاپے میں ہضم نہیں کر پاتا۔ اس لیے غذائیں اور خوراک عمر کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ کوئی بھی عمر ہو اور کوئی بھی غذا ہو، غذا کا بنیادی مقصد ایک ہی ہے۔

غذا کا مقصد انسان کی بقا، اس کے اعضا جسم کی نشوونما اور مرمت اور کام کرنے کے لیے ان کو توانائی پہنچانا ہے۔ اس سے انسان کی ہر طرح کی صلاحیت اور استعداد کو قوت ملتی ہے جس سے وہ اپنے تمام اعضا کا استعمال موثر طریقے سے کرتا ہے۔ اسی کی وجہ سے انسان پر باہری اثرات کم پڑتے ہیں اور وہ بہت سے امراض سے محفوظ رہتا ہے۔ غذا کی ضرورت انسان کو ماں کے پیٹ سے لے کر مرتے دم تک رہتی ہے۔

صحت اور بیماری کا انحصار کئی باتوں پر ہے مثلاً: آب وہوا، اصول صحت، ورزش، حادثاتِ زمانہ، غذا، موروثی اور نفسیاتی اثرات وغیرہ۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا اثر الگ ہے جو وقتاً فوقتاً حاوی ہو جاتی ہے۔ لیکن ان سب میں غذا کا اثر سب سے زیادہ اور سب سے اہم ہے۔ کسی تنگ، نم اور تاریک مکان میں رہ کر مناسب غذا استعمال کر کے ان چیزوں کے برے اثرات سے مدافعت کی جا سکتی ہے اور تندرستی برقرار رکھی جا سکتی ہے۔ برخلاف اس کے آدمی اگر بہت کشادہ، ستھرے، ہوادار اور روشن مکان میں رہے، وہ خوب ورزش بھی کرتا ہو لیکن اس کی غذا اگر ناقص ہے تو وہ کمزور ہوگا اور اس کی صحت برباد ہو جائے گی۔ اس حقیقت کا اندازہ ہم کو آئے دن اپنے اور پاس پڑوس کے لوگوں کی زندگیوں کو دیکھ کر ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہم کو اچھی اور مناسب غذا کے حصول کے لیے ہر امکانی کوشش کرنا چاہیے

تا کہ ہماری صحت اچھی اور برقرار رہے۔

انسان کے دیگر مسائل اور ضروریاتِ زندگی کسی نہ کسی شکل میں مسئلۂ غذا سے وابستہ ہیں۔ اس بنیادی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے بڑی بڑی حکومتیں اور ان کے مفکرین کوشاں ہیں۔ اس کے لیے ملکوں میں وزارتِ خوراک کی تشکیل کی جاتی ہے۔ ان سب کے باوجود دنیا کی ایک بڑی آبادی نقص تغذیہ اور سوء تغذیہ کا شکار ہے۔ اس کی وجہ عموماً غریبی ہے۔ لیکن یہ بھی دیکھا گیا کہ غذا کی فراوانی کے باوجود بھی کبھی کبھی ہم ایسی بیماریوں کے شکار ہو جاتے ہیں جو غذا کی کمی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ دراصل ہماری غذا کے بارے میں لاعلمی اور لاپروائی ہے۔ ہم تغذیات کی اہمیت کو نہیں جانتے اور ہماری خوراک کبھی کبھی ضروری غذائیت سے خالی ہوتی ہیں۔ اس کو اس طرح سمجھیے کہ ایک حاملہ عورت ہے، خون بننے کے لیے اس کو غذا میں لوہے کی ضرورت ہے۔ اگر لوہا غذا میں کم ہوگا تو عورت انیمیا کا شکار ہوگی۔ اسی طرح اس کے بچے کی صحیح تخلیق کے لیے کیلشیم، فاسفورس اور وٹامن ڈی کی ضرورت ہے۔ اگر عورت کو مناسب مقدار میں وٹامن ڈی، جو بہت کم غذاؤں میں ہوتا ہے، نہ ملے اور وہ گھر کے کمروں میں محدود رہے، جس سے دھوپ سے بھی وٹامن ڈی نہ بن سکے تو غذا کی تمام فراوانی کے باوجود بچے کی ہڈیاں کمزور ہوں گی، اس کو سوکھے اور کساح کی بیماری ہو جائے گی جس کی وجہ سے اعضا کمزور اور ٹیڑھے ہو جائیں گے۔

اس لیے غذا کے بارے میں چند بنیادی اور ضروری باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ ہمیں اپنی آمدنی کا بڑا حصہ غذا پر خرچ کرنا چاہیے۔ غذا کو اچھی حالت میں خریدنا چاہیے۔ گھنا، کیڑا لگا اور سڑا اناج اکثر غذائیت سے خالی ہوتا ہے۔ سبزیاں، پھل وغیرہ تازے اور رس دار ہونے چاہیے۔ سڑے اور سوکھے پھل اور ترکاریاں غذائیت کے کئی ضروری اجزا کھو دیتی ہیں اور جسم میں بیماریوں کے جراثیم پیدا کرتی ہیں۔ بہت سے دیسی پھل اور ترکاریاں جو سستی ہوتی ہیں ان میں بہت مفید اجزا ہوتے ہیں جن کو ہم نہیں جانتے۔ اس بارے میں معلوم کرنا چاہیے اور موسم کے پھل اور سبزیاں خوب استعمال کرنا چاہیے۔ اگر ہم کاشت کرتے ہیں تو زمین میں اچھی کھاد دینا چاہیے۔ اس سے پھلوں، ترکاریوں اور اناج میں اچھی غذائیت کے اجزا آئیں گے۔ اس طرح ایک عام آدمی کم آمدنی کے باوجود اچھی غذا حاصل کر سکتا ہے۔ غذا کے تمام اجزا کا استعمال کرنا چاہیے۔ سبزی اور پھلوں کے کئی جزو جن کو ہم چھیل کاٹ کر پھینک دیتے ہیں اپنے اندر غذائیت رکھتے ہیں۔ اس لیے تمام کارآمد حصے استعمال کر لینا چاہیے۔ گیہوں، چنا، چاول وغیرہ کی بھوسی اور چوکر میں بھی بہت کارآمد اجزا ہوتے ہیں، اس لیے حتی الامکان اناج کے تمام حصوں کو استعمال کرنا چاہیے۔

خوراک میں جانوروں سے حاصل کچھ غذا جیسے دودھ، انڈا، گوشت، مچھلی وغیرہ ضرور شامل کرنا چاہیے۔ جو لوگ گوشت نہیں کھاتے وہ بھی دودھ اور اس سے بنی دوسری چیزوں سے خوب اچھی غذائیت مثلاً پروٹین حاصل کر سکتے ہیں۔ ان لوگوں کو دالیں زیادہ کھانا چاہیے تاکہ دودھ اور دالوں سے ان کو پروٹین کی مناسب مقدار حاصل ہو جائے۔ مختلف اناجوں کو ملا کر کھانا چاہیے تاکہ ایک دوسرے کی کمی پوری ہو جائے۔

غذا کو خرابی سے بچانے کے لیے احتیاطی تدابیر کرنا چاہیے۔ کھانا پکاتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ کوئی ضروری چیز پانی میں گھل کر یا پکانے میں جل کر ضائع نہ ہو۔ اس کے لیے بتائے گئے اصولوں کو برتنا چاہیے۔ خوراک کو مفید اور لذیذ بنانے کی کوشش کرنا چاہیے تاکہ رغبت سے کھائی جائے اور آسانی سے تحلیل ہو جائے۔ مناسب غذاؤں کو معلوم کر کے ان کا خاص حالتوں میں زیادہ استعمال کرنا چاہیے۔ بھوک سے زیادہ ہرگز نہیں کھانا چاہیے، اس سے آدمی کئی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔ معمولی ورزش، چہل قدمی اور محنت کے کاموں سے کھانا خوب ہضم ہوتا ہے اور جسم چست اور پھرتیلا رہتا ہے۔ انسان میں سوچنے اور کام کرنے کی ہمت پیدا ہوتی ہے۔ زیادہ چربی والی غذاؤں کے مقابلہ میں پروٹین والی غذائیں اچھی ہوتی ہیں۔ خوراک میں پھل، سبزی اور دودھ کا استعمال اپنی حیثیت کے موافق زیادہ سے زیادہ کرنا چاہیے۔ اگر ہم ان باتوں کا خیال رکھیں گے تو سوئے تغذیہ کا شکار نہ ہوں گے اور بہت سے امراض سے محفوظ رہیں گے۔

(ماخوذ: ہماری غذا، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، تیسری طباعت: 2010)

حسن کی نگہداشت

پیروں کو ملائم بنانے کے لیے ایک ایسا مساج جس کے نتائج کردے آپ کو حیران

پیروں کو ملائم رکھنے کے لیے پیروں کے مردہ خلیے ختم کرنا ضروری ہے۔ اس کے لیے ایڑیوں، انگھوٹھے، انگلیو، ٹخنوں اور تلوے پر سرکہ اور دہی کا مساج کریں۔

بلیک ہیڈز کے خاتمے کے لیے اب کسی ماسک کی ضرورت نہیں اس گھریلو ٹوٹکے سے فائدہ اٹھائیں

اس مقصد کے لیے بیسن میں دہی کی معمولی مقدار شامل کرنے سے جلد پر بہترین نتائج حاصل ہوتے ہیں اور بلیک ہیڈز کا خاتمہ آسانی سے ہوجاتا ہے۔

تربوز سے بنائیں اینٹی ایجنگ کریم جو بنائے آپ کو حسین

تربوز کے چھلکے، تربوز کا گودا ان دونوں کو بلینڈ کرلیں۔ اگر چھائیاں ہیں تو ناریل کا تیل بھی شامل کرسکتے ہیں۔ ان تمام چیزوں کو اچھی طرح پکاتے رہنا ہے جب تک پانی خشک نہ ہوجائے۔ پھر اس کو نکال کر جیسے ماسک لگاتے ہیں ویسے ہی استعمال کریں۔

ناخنوں کی حفاظت کے لیے بہترین ٹپ جو بنائے ناخنوں کو چمکدار اور خوبصورت

ناخن پر چمک پیدا کرنا ہو تو لیموں کا رس ناخن پر ملنا چاہیے ناخنوں پر چمک پیدا ہو جائے گی۔ ایسا کرنے سے ناخن چمکدار اور خوبصورت ہو جائیں گے۔

گردن بھی آپ کی توجہ کی طلبگار ہے اسے خوبصورت بنانے کے لیے یہ زبردست نسخہ شروع کر دیں

اجزا: لینولین 1 کھانے کا چمچ، گلیسرین 1 کھانے کا چمچ، وہیٹ جرم آئل 1 کھانے کا چمچ، شہد کی مکھیوں کا موم 1 چائے کا چمچ، لیونڈر آئل 6 قطرے، وٹامن A اور D کیپسول

طریقہ:

ان تمام اجزا کو ملا کر ڈبل بوائیلر میں گرم کر لیں۔ اچھی طرح مکس کر کے چولہے سے اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔ اب اسے کسی بوتل میں محفوظ کر کے فریج میں رکھ دیں۔ اپنی انگلیوں کی مدد سے گلے پر ہنسلی کی ہڈی سے اوپر کی جانب حرکت دیتے ہوئے تھوڑی پر لگائیں۔ کچھ دیر بعد پانی سے دھو لیں۔ اس سے گردن صاف اور خوبصورت ہو جائے گی۔

جسم پر سے تل کو با حفاظت ختم کرنا چاہتے ہیں تو یہ طریقہ آزمائیں۔

تل کو ختم کرنے کے لیے روزانہ ویسلین کریم بھی ایک فائدہ مند طریقہ ہے۔ ہرا دھنیے کو پیس لیں اور جہاں پر تل ہوں اس جگہ پر لگائیں۔ یہ طریقہ کچھ دن میں آپ کے تل کو ختم کر دے گا۔ درج بالا طریقے کو کم از کم بیس دنوں تک استعمال کریں۔

کیل مہاسوں کا خاتمہ صرف کیلے کے چھلکوں سے ابھی آزمائیں

چہرے کے مہاسوں پر کیلے کے چھلکے کو مسل کر پانچ منٹ تک لگانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کیلے کے چھلکے جلد میں پانی کی کمی کو بھی پورا کرتے ہیں۔

چہرے کی خارش اور الرجی سے چٹکیوں میں نجات کا گھریلو اور آسان طریقہ

دھول مٹی کے باعث اگر آپ کے چہرے میں خارش اور الرجی رہتی ہے تو مولی کا رس چہرے پر ملیں یا جو کے آٹے میں مولی کا رس ملا کر چہرے پر ملنے سے چہرے کی خارش ختم ہو جاتی ہے۔

(بحوالہ hamariweb.com)

تاثرات: نگرنگرسے

دسمبر 2018 کا ''خواتین دنیا'' ہاتھوں میں ہے۔ سب سے پہلے اداریہ پر نظر گئی۔ اداریہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اداریہ میں موصوف نے بڑے سلیقے سے خواتین کے کارناموں کا اعتراف کیا ہے اور ان کے مسائل پر غور کیا ہے۔ خصوصاً یہ جملے بہت اہم ہیں:

> ''عالمی منظرنامے پر اگر نظر ڈالی جائے تو خواتین کی شمولیت ہر میدان میں نظر آتی ہے۔ نیرنگیٔ زمانہ کے اعتبار سے عورت کے کئی روپ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس بات سے بھلا کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ فی زمانہ زندگی کے تمام میدانوں میں اس نے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ اس کے باوجود آج بھی کئی شعبوں میں زبوں حالی و پسماندگی سے دوچار ہے۔''

گزشتہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی بڑی عرق ریزی اور محنت سے تیار کیا گیا ہے۔ مضامین کا انتخاب بہت اچھا ہے۔ بلقیس ظفیر الحسن کا انٹرویو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اس کے لیے میں بہت شکر گزار ہوں۔ بلقیس ظفیر الحسن اور مینا نقوی کی غزلیں قابل داد ہیں۔ امریتا پریتم، صغرا مہدی اور قدسیہ زیدی نے اردو کے نسائی ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ تینوں خواتین کے فکر وفن پر تحریر کردہ مضامین قابل استفادہ ہیں۔ ٹائٹل پیج پر صغرا مہدی کی تصویر دیکھ کر یاد تازہ ہوگئی، بہت سی ملاقاتیں یاد آگئیں۔ سادہ طبیعت اور صاف گو خاتون تھیں۔ ان کو اپنے عورت ہونے پر بہت فخر تھا اور اس بات پر بہت غصہ کرتی تھیں کہ خواتین مردوں کی برابری کیوں کرتی ہیں، ان کا خیال تھا ''مرد کوئی اونچی چیز نہیں ہے، جس کا مقابلہ کیا جائے۔'' ان کی تخلیقات پر صالحہ عابد حسین کا اثر صاف طور پر دیکھنے کو ملتا۔ نیلوفر یاسمین کا مضمون ''اردو شاعری کی نمائندہ تانیثی آوازیں'' معلوماتی مضمون ہے۔ افسانوں کا انتخاب بھی قابل ستائش ہے۔ مجموعی طور پر ''خواتین دنیا'' اردو ادب میں ایک اہم مقام حاصل کرتا جارہا ہے۔ حقیقت میں یہ رسالہ خواتین کے لیے بہترین تحفہ ہے۔

ڈاکٹر نشاں زیدی، ڈی۔ ایل۔ ایف، کالونی، غازی آباد (یوپی)

آج جیسے ہی خواتین دنیا ماہ فروری 2019ء کا شمارہ ہاتھ میں لیا اور اسے پڑھنا شروع کیا تو یوں محسوس ہوا کہ اب کوئی میرے مطالعے میں خلل نہ پیدا کرے اس شمارے کا نام 'خواتین دنیا' ہے مگر اس کے پڑھنے والے صرف خواتین ہی نہیں بلکہ مرد حضرات بھی ہیں۔ اس رسالے میں خواتین سے متعلق بہت سے مسئلے حل ہوتے نظر آرہے ہیں۔ خواتین دنیا میں شائع ہونے والے مضمون کا لب ولہجہ ادب کی دنیا سے محبت کرنے پر مجبور کررہا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اردو زبان کو فروغ دینے کا عملی کارنامہ انجام دے رہا ہے۔ 'بچوں کی دنیا'، 'اردو دنیا' اور اب 'خواتین دنیا'

نے ادب کی دنیا میں ایک نیا اضافہ کیا ہے۔ جس کی وجہ سے آج کل ٹیکنالوجی کے دور میں بھی قارئین ان رسالوں کی آمد کا بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں اور انتظار کرنا لازمی بھی ہے۔ میں نے ابھی جس شمارے کا مطالعہ کیا وہ فروری 2019 کا ہے۔ اس میں سب سے پہلا سکندر علی وجد کا مضمون ہے جو کہ ڈاکٹر شاہین فاطمہ کا تحریر کیا ہوا ہے، اس میں سکندر علی وجد کی شاعری اور ان کے انداز بیاں پر جو گفتگو کی گئی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ میں آپ کے توسط سے محترمہ ڈاکٹر شاہین فاطمہ صاحبہ کو دلی مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔ ادبی شخصیتوں کے حالات زندگی کو پیش کرنے والے اداریے، شخصیت، اشعار کے انتخاب کے لیے نکہت سخن، جہان نسواں میں قلمکاروں کے ذریعے لکھی گئی تحریرات، 'مسلم خواتین کے تعلیمی و عائلی مسائل'، 'اردو تحقیق کے مسائل اور حل'، میں محترمہ نغمہ تبسم صاحبہ نے تحقیق کی دنیا میں قدم رکھنے والے طالب علموں کے لیے موضوع کے انتخاب کو لے کر جو رہنمائی کی ہے وہ بھی قابل مبارکباد ہیں۔

اُردو زبان کے فروغ کے لیے آپ نے جو حکمت عملی اختیار کی ہے اس سے غیر اردو داں بھی اس طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ اتنی کم قیمت میں اتنا عمدہ رسالہ ادبی دنیا میں کبھی شائع نہیں کیا گیا ہوگا۔ رنگین اوراق، اس پر بہترین نقش و نگاری، تصاویر کا بہترین انتخاب یہ اس کی خصوصیات میں شامل ہے۔ اپنی بات اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ یا رب العزت اس ادارے سے شائع ہونے والے ہر رسالے کو اسی طرح مقبولیت عطا کرے۔ (آمین)

خان محمد یاسر، محسن احمد اُردو پرائمری اسکول، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

ماہنامہ 'خواتین دنیا' کا جنوری 2019 شمارہ دیکھا اور پڑھا۔ انتہائی خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ طباعت اور گیٹ اپ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اردو زبان میں خواتین کے بہت کم رسالے شائع ہوتے ہیں۔ لیکن این سی پی یو ایل نے اس کمی کو دور کیا ہے۔ جس کے لیے کونسل مبارکباد کی مستحق ہے۔ خواتین دنیا کے تازہ شمارہ میں سمیع الدین اطہر کا مضمون 'بھارت کی پہلی معلمہ: ساوتری بائی پھلے' اور ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان کا مضمون '1857 کی پہلی خاتون مجاہدہ: عزیزن بائی' پڑھ کر تاریخی معلومات میں زبردست اضافہ ہوا۔ ایسے مضامین اور ایسی شخصیات کے بارے میں پڑھنے سے حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ دونوں قلمکاروں کو بہت بہت مبارکباد۔ اس کے علاوہ شمارہ میں 'نکہت سخن' میں شاعرات کے منتخب اشعار بھی خوب ہیں۔ 'جہان نسواں' میں صابر علی سیوانی کا تحریر کردہ مضمون 'نسائی ادب کا خوبصورت استعارہ: فہمیدہ ریاض' بھی کافی دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ اس سے ہمیں شاعرہ فہمیدہ ریاض کی علمی اور ادبی شخصیت کا پتہ چلتا ہے۔ دیگر مضامین بھی قابل مطالعہ ہیں۔ 'حسن سخن' کے تحت شائع صفیہ شمیم، زاہدہ زیدی، ثمینہ راجہ، نوید اختر کی کاوش بھی قابل تحسین ہے۔ 'باورچی خانہ'، 'صحت'، 'آرائش و زیبائش' کالم میں بھی معلوماتی مواد ہے جو ہمارے لیے بے حد مفید ثابت ہوگا۔ اس شاندار شمارہ کے لیے میری جانب سے مبارکباد قبول کریں۔

گلشن بانو وفا، شاہجہاں پور (یوپی)

ماہنامہ خواتین دنیا مارچ 2019 کا شمارہ ملا۔ دیدہ زیب سرورق نے دل موہ لیا۔ تمام مشمولات معیاری اور دلچسپ ہیں۔ گلشن آرا نے ''مادری زبان کی اہمیت اور والدین کی ذمہ داریاں'' ایک اچھا مضمون قلم بند کیا ہے۔ محمد نہال افروز کا مضمون ''اردو افسانوں میں نسائی مسائل کی عکاسی'' بھی ایک بہترین مضمون ہے۔ ''گھر کا چراغ'' بیٹی پر بیٹے کو ترجیح دینے والوں کے لیے ایک سبق آموز کہانی ہے۔ جس کے لیے خلیق النساء واقعی مبارکباد کی مستحق ہیں۔ کہانی میں تسلسل اور روانی بھی موجود ہے۔

ترنم جمال کی کہانی ''اپنا عکس''، عرفانہ تزئین شبنم کی کہانی ''اوقات'' اور مہوش نور کی کہانی ''مہنگا اولڈ ایج ہوم'' یہ تینوں کہانیاں، ماں، بیٹا، بہو اور اولڈ ایج ہوم، اسی مرکزی خیال کے ارد گرد گھومتی ہیں۔ تینوں کہانیاں اپنی اپنی جگہ پر بہترین تاثرات قائم کرنے میں کامیاب ہیں، جن کے کلائمیکس بھی چونکانے والے ہیں۔ محمد قیوم میو کی کہانی ''رشتہ'' میں ایک ماں کی اپنی بیٹی کے متعلق والہانہ محبت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ کہانی بھی ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کراتی ہے۔

محمد علیم اسماعیل، ناندورہ، مہاراشٹر

میں نے ماہنامہ 'خواتین دنیا' اپریل 2019 کا مطالعہ کیا۔ مطالعے کے دوران مجھے محسوس ہوا کہ اس رسالے کے مضامین اعلیٰ اور معیاری ہیں جن کو پڑھ کر ہم جیسے طالب علموں کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ اپریل کے شمارے کے تمام مضامین خواتین سے متعلق ہیں۔ جس میں خواتین سے متعلق اہم مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس شمارے کی کہانیاں بھی پڑھنے کے لائق ہیں۔ 'حسن سخن' میں ادا جعفری اور گلشن بانو وفا کی غزلیں مجھے بہت پسند آئی۔ 'لذیذ پکوان' کی تمام ریسیپیز کو پڑھ کر میں نے اسے گھر پر بنانے کی کوشش کی تھی۔ سورج کی کرنیں ہمارے لیے کتنی مفید ہیں اس بات کا اندازہ صحت سے متعلق مضمون کے ذریعے ہوتا ہے۔ جلد کی دیکھ بھال کا طریقہ بھی بہت کارآمد اور مفید ہے۔

شاد، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

□□□

جامعہ کی 100 سالہ تاریخ میں پہلی خاتون وائس چانسلر نجمہ اختر نے عہدہ سنبھالا

پروفیسر اختر نے وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالنے کے بعد اپنے پیغام میں کہا ہے کہ وہ 1920 میں قائم اس یونیورسٹی کے بانیوں محمد علی جوہر اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی عظیم شخصیات کے خوابوں کو پورا کریں گی۔

نئی دہلی: (12 اپریل) جامعہ ملیہ اسلامیہ کی 100 سالہ طویل تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی خاتون کو وائس چانسلر کے عہدے پر فائز کیا گیا ہے۔ یہ اعزاز پروفیسر نجمہ اختر کو حاصل ہوا ہے، گزشتہ روز ان کے نام کا اعلان کیا گیا تھا اور جمعہ کے روز انھوں نے اپنا عہدہ سنبھال لیا۔

پروفیسر نجمہ اختر نے عہدہ سنبھالنے کے بعد کہا ہے کہ وہ جامعہ کو عالمی سطح کا تعلیمی ادارہ بنانے کے لیے کوشاں ہیں اور اس کے عظیم بانیوں کے خوابوں کو پورا کریں گی۔

پروفیسر اختر نے وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالنے کے بعد اپنے پیغام میں کہا ہے کہ وہ 1920 میں قائم اس یونیورسٹی کے بانیوں محمد علی جوہر اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی عظیم شخصیات کے خوابوں کو پورا کریں گی اور اسے ایک

جامع تعلیمی ادارہ بنائیں گی، جہاں امن اور انصاف قائم ہو اور تعلیم کے معیار میں اضافہ ہو۔

انھوں نے آج وائس چانسلر کا عہد عہدہ سنبھال لیا ہے۔ انھیں کل یعنی 11 اپریل کو جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی کا نیا وائس چانسلر مقرر کیا گیا تھا۔ پروفیسر اختر نہ صرف جامعہ بلکہ دہلی کی کسی بھی مرکزی یونیورسٹی میں وائس چانسلر کے عہدے پر فائز ہونے والی پہلی خاتون ہیں۔ پروفیسر اختر کو 130 ملکوں کے سینئر افسروں کے لیے بین الاقوامی تعلیمی انتظامیہ کورس قیادت کے لیے جانا جاتا ہے، جس کے لیے انھوں نے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ ایڈمنسٹریشن (این آئی ای پی اے) میں 15 برسوں تک کام کیا ہے۔

واضح رہے کہ گزشتہ سال طلعت احمد نے مدت ختم ہونے سے پہلے ہی اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا، اب تک پروفیسر شاہد اشرف بطور کارگزار وائس چانسلر فرائض انجام دے رہے تھے۔

پروفیسر نجمہ اختر کی تقرری کی منظوری جمعرات کو صدر جمہوریہ رام ناتھ کووند نے دی تھی۔ ان کے علاوہ سلیکشن کمیٹی کی جانب سے دو اور نام صدر جمہوریہ کے پاس بھیجے گئے تھے، جن میں 'اسوسی ایشن آف انڈین یونیورسٹیز' کے سکریٹری جنرل فرقان قمر اور آئی آئی ٹی دہلی کے پروفیسر ایس ایم اشتیاق کے نام شامل تھے۔ صدر جمہوریہ تمام مرکزی یونیورسٹیوں کے 'ویزیٹر ہیڈ' ہیں اور انھی کے ذریعہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی تقرری عمل میں آتی ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ماہر تعلیم پروفیسر نجمہ اختر کی تقرری پر قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر شاہد اختر نے اظہار تہنیت کرتے ہوئے کسی بڑے ادارے میں کسی مسلم خاتون کو اعلیٰ عہدے پر فائز کرنے پر مرکزی حکومت کا شکریہ ادا کیا۔

پروفیسر شاہد اختر نے اس تقرری کو مسلم خواتین کو پسماندگی سے نکالنے اور مساوی حقوق و مواقع دیے جانے کے اقدام پر محمول کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح مسلم عورتوں کو تعلیمی، سماجی، سیاسی اور معاشی طور پر مستحکم کرنے کی حکومت کی کوششوں کو مہمیز لگے گی۔

کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عقیل احمد نے پروفیسر نجمہ اختر کو مبارکباد دیتے ہوئے امید ظاہر کی کہ ان کی قیادت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ ترقی کی نئی منزلیں طے کرے گا، نئے شعبہ جات کے قیام سے جامعہ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوگا اور خواتین کے لیے یقینی طور پر نئے شعبے کا قیام ان کی ترجیحات میں شامل ہوگا۔

محترمہ کی سربراہی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک مثالی ادارے کی حیثیت سے پوری دنیا میں اپنی شناخت قائم کرنے کے یقین کے ساتھ ڈاکٹر احمد نے کہا کہ وائس چانسلر کی حیثیت سے نجمہ اختر کی تقرری سے مسلم خواتین میں ایک مثبت پیغام بھی جائے گا جس سے خواتین کو نہ صرف نئی تحریک ملے گی بلکہ ان کے اندر بھی ایک نیا حوصلہ اور نیا عزم جنم لے گا۔

بی ٹیک کمپیوٹر انجینئرنگ کی طالبات نے بین الاقوامی کانفرنس میں عمدہ ترین تحقیقی مقالے کا ایوارڈ حاصل کیا

علی گڑھ، اخبار مشرق، 21 اپریل: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے بی ٹیک کمپیوٹر انجینئرنگ کی طالبات زینت فرحین اور طیبہ باسط اور شعبہ کے اسسٹنٹ پروفیسر مسٹر منیب حسن خاں کو نئی دہلی کے اے آئی سی

ٹی ای آڈیٹوریم میں ڈیجیٹل درسیات کے موضوع پر منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس میں عمدہ ترین تحقیقی مقالے کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان کے مقالے کا موضوع تھا: A novel Android based application for collaborative learning in collegers۔ اس مقالے میں ذاکر حسین کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹکنالوجی میں خاص طور سے اور سبھی کالجوں میں عام طور سے باہمی تعاون سے لرننگ کے لیے پلیٹ فارم مہیا کرانے سے بحث کی گئی تھی۔ باہمی تعاون سے لرننگ میں دراصل سوشل نیٹ ورکنگ ٹولس کا استعمال کیا جاتا ہے جس سے اساتذہ اور شاگردوں کے درمیان لرننگ پروسیس بہتر ہوتا ہے۔ کمپیوٹر انجینئرنگ شعبہ کے سربراہ پروفیسر ایم سروش عمر نے شعبہ کے طالبات کو ایوارڈ ملنے پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے انھیں مبارکباد پیش کی ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

آہنگ اور عروض

مصنف: کمال احمد صدیقی

صفحات:257

قیمت: 125روپے

قدیم ہندوستان کی تاریخ

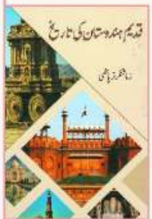

مصنف: رماشنکر ترپاٹھی، مترجم: سید سخی حسن نقوی

صفحات:581

قیمت: 345روپے

نئی اردو قواعد

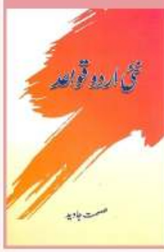

مصنف: عصمت جاوید

صفحات:334

قیمت: 140روپے

اصولِ طب

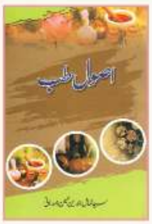

مصنف: سید کمال الدین حسین ہمدانی

صفحات:508

قیمت: 170روپے

اوراقِ سائنس

مصنف: عبدالودود انصاری

صفحات:188

قیمت: 105روپے

ڈر کے آگے جیت ہے

مصنف: محمد فروغ جعفری

صفحات:72

قیمت: 25روپے

منی کا تحفہ

مصنف: شفیع الدین نیر

صفحات:74

قیمت: 25روپے

جانے انجانے جاندار

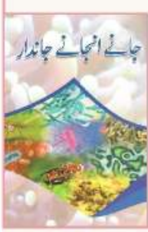

مصنف: شمس الاسلام فاروقی

صفحات:66

قیمت: 35روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly May 2019, Vol. 03, Issue: 05
RNI. No. DELURD/2017/74026
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025